پیپلز ہسٹری آف بلوچستان

جلد 2

بلوچ ریاست کی تشکیل

شاہ محمد مری

ضابطہ

کتاب: بلوچ ریاست کی تشکیل

مصنف: شاہ محمد مری

پہلا ایڈیشن: 1999ء

دوسرا ایڈیشن: 2010ء

تیسرا ایڈیشن: 2016ء

چوتھا ایڈیشن: 2021ء

اُس خوش نصیب ساعت کے نام

جب انسان نے پہلی بار پتھر کو پیداوار کے آلہ

کے بطور استعمال کیا

فہرست

پیش لفظ 7

پہلا چیپٹر

قدیم بلوچستان، حملہ آوروں کی تحریروں میں

آگ اور اُس کی پرستش 11

سکندرِ یونانی کے مورخین 17

اشوک کے آثار 26

مزدکی بلوچ تحریک 33

چچ اور چچ نامہ 45

عرب تحریریں 48

بلوچستان، مابعد خلافتِ اسلامی 58

دوسرا چیپٹر

بلوچ کلاسیکل عہد

کلاسیکی عہد 71

رند و لاشار خانہ جنگی 87

وطن بدر چاکر 90

بلوچ اور مغل 93

تیسرا چیپٹر

فیوڈلزم کا فروغ

بلوچ ریاست کی باقاعدہ تشکیل 103

پیٹر دی گریٹ، نصیر خان نوری 113

چوتھے ایڈیشن کا پیش لفظ

فلاسفر نے کہا، ''ہمیں اپنے بچوں کو دو تحفے دینے چاہئیں: ایک جڑیں، اور دوسرا، پَر''۔ جڑ دراصل ہسٹری ہے۔ اور ہسٹری عوام الناس بناتے ہیں۔ اسی لیے میں نے کتاب کا نام ''پیپلز ہسٹری'' رکھا۔ اور عوام، چوں کہ ہسٹری ہوا میں نہیں بناتے بلکہ زمین کے ایک ٹکڑے کے اندر بناتے ہیں۔ اسی لیے میری کتاب کا پورا نام ہے: پیپلز ہسٹری آف بلوچستان۔

یہ اس سلسلے کی دوسری جلد ہے۔

اس جلد کو لکھنے میں مجھے اچھی خاصی دشواری ہوئی۔ اندازہ ہوا کہ بلوچ کی تاریخ لکھنے والا شخص جب تک پری ہسٹاریکل (یعنی آرکیالوجی کے) زمانے کو لکھ رہا ہوتا ہے تو اُسے زیادہ مشکل نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آرکیالوجی بہت جمہوری اور غیر طبقاتی ہوتی ہے۔ یہ صرف حاکم یا پنڈت کے بودوباش کے لیے کھدائی نہیں کرتی اور نہ ہی وہ محض امیروں اور بادشاہوں کی قبریں کو دریافت کرنے کی نیت سے ریسرچ کرتی ہے۔ بلکہ آرکیالوجی نامی سائنس سماج کے سارے طبقات اور لوگوں کے گھر، گلیاں، مارکیٹ، عقائد، رسومات، اور مندر کے بارے میں معلومات مہیا کرتی ہے۔

مگر جب ہم پری ہسٹاریکل دور سے آگے نکلتے ہیں تو ایسے زمانوں میں آجاتے ہیں جب ہمیں بلوچ تاریخ حملہ آوروں اور بادشاہوں کے منشیوں کی لکھی رپورٹوں میں سے کھنگالنی پڑتی ہے۔ وہاں بہت کنفیوژن ہوتی ہے۔ وہ منشی صرف اپنے آقا کے بارے میں لکھتا تھا۔ وہ اُس کی بے شمار

داشتاؤں اور باڈی گارڈوں کے بارے میں، اُس کی ہیبت و دہشت، اُس کے حملوں اور فتوحات سے متعلق مبالغہ آمیز مواد سے بھری باتیں لکھتا تھا، اور اُسے ہسٹری کا نام دیتا تھا۔ منشی کی لکھی پوری کتاب میں ہمارے عام آدمی کے بارے میں کبھی کبھی تو ایک آدھ پیراگراف بھی نہیں ملتا تھا۔

تاریخ نویسی میں مددگار کے بطور خود بلوچ (اور اس کی شاعری) بہت دیر بعد داخل ہوا۔ اُس کی شاعری یا ضرب الامثال ہمیں پندرھویں صدی سے ملنے لگتے ہیں۔ اسی شاعری کے بعد کے زمانے سے، ہم بلوچ کو اپنی تاریخ کے بارے میں بولتے دیکھتے ہیں۔ یوں سکندر سے لے کر مزدک تک کے زمانے کی لکھی تاریخیں ہمارے عام آدمی کے تذکرے سے تقریباً خالی ہیں۔ چنانچہ اِس پورے دور میں اور اس کے بعد بھی صرف منشیوں کے لکھے ہوئے سے ہمیں عام آدمی کی تاریخ چھاننا پڑتی ہے۔ اور یہ بہت دشوار مرحلہ ہوتا ہے۔

پندرھویں صدی کے بعد ہم محض حملہ آوروں کی طرف سے دی گئی تاریخ کے محتاج نہیں ہیں۔ کچھ نہ کچھ ہمارے اپنے بزرگوں کی پگڑی کے پلّو میں ضرور بندھا ملتا ہے، کوئی شاعری، کوئی ضرب المثل، کوئی آثار، کوئی کہانی۔۔۔۔ ہمارا قلم اب بے ہتھیار نہیں رہ جاتا۔ اور ہم اُس زمانے کی عوامی زندگانی کے بارے میں مواد تلاش کر سکتے ہیں۔ یعنی آگے جا کر ہم اپنے بزرگوں اور اسلاف کا ہاتھ پکڑنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اور یوں، عوامی تاریخ کو بیان کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔

یوں اِس جلد میں ہم آوروں اور بادشاہوں کے شاہناموں کو کنگھال کر بلوچ عام آدمی کے ارتقائی سفر کے بارے میں کچھ بول سکتے ہیں۔

چنانچہ اِس جلد میں ہم اپنے سفر کو مزدک سے شروع کرتے ہیں اور اُسے اُس مقام تک لاتے ہیں جب اولین بلوچ ریاست قائم ہوتی ہے۔

شاہ محمد مری

ماوند

29 جنوری 2021ء

پہلا چیپٹر

قدیم بلوچستان، حملہ آوروں کی تحریروں میں

کہتے ہیں کہ فتوحات کے دلدادہ سائرس کو وسطی ایشیا میں ایک مہم کے دوران قتل کیا گیا۔ انھوں نے اُس کا سر کاٹ کر خون سے بھرے ایک مشکیزے میں ڈال دیا اور کہا: ''تمھیں خون چاہیے تھا، اب جتنا چاہو پیتے رہو''۔

آگ اور اُس کی پرستش

بلوچ ہزار ہا برسوں سے قبائلی تنظیم میں منظّم چلے آ رہے ہیں۔ پیداواری رشتوں میں ترقی نہ ہونے کے بے شمار اسباب ہیں۔مگر دو اہم ہیں: باہمی لڑائیاں' کشت وخون، اور بیرونی حملہ آوروں کی طرف سے ہونے والے غارت گر حملے۔ یہ ایک بہت ہی شیطانی دائرہ ہے جو ٹوٹتا ہی نہیں۔نتیجہ یہ کہ بلوچ کا فیوڈل ازم ہزاروں سالوں تک قائم رہا۔منڈی کی عدم موجودگی کے باعث قبائلی علاقے ایک دوسرے سے منسلک ومربوط نہ ہوئے اور بہت عرصے تک بلوچ ایک قوم کی صورت اختیار نہ کرسکے۔

البتہ جب بھی کسی غیرقوم کی طرف سے جارحیت ہوئی تو قرب وجوار کے قبائل مل جاتے تھے اور ایک اتحاد یہ کے بطور اُس جارح کا سامنا کرتے تھے۔یعنی جب بھی باہر کی قوم سے واسطہ (زیادہ تر دشمنی اور کم تعداد میں دوستی میں) پڑتا تھا تو ہماری محدود داخلی یکجہتی فوراً بڑھ جاتی۔ ہم یک دم اشتراک کی باتیں ڈھونڈنے لگ جاتے تھے، فوراً اپنے سماجی، لسانی، زمینی اور تاریخی اتحاد کے نکات تلاش کرلیتے۔ ایک بن جاتے، اور خارجی طاقت سے نمٹ لیتے۔

اور پھر اُسی جوش وخروش سے ''باہم مختلف ہونے کے دلائل'' ڈھونڈتے۔ لڑائی اور علیحدگی کے بہانے تلاش کرتے............اور یہ بہانے مل ہی جاتے تھے۔

ایک ہزار سال قبل مسیح میں ایران اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بسنے والے لوگ ایک ہی قبیلے یا گروہ کے لوگ نہ تھے۔انھی لوگوں میں سے کچھ کی اولاد ''ماد'' کہلاتی تھی۔708 ق م

کے قریب مغربی ایران میں ماد حکومت قائم ہوئی۔ اس کا پایہِ تخت موجودہ ہمدان تھا۔ اس حکومت کے بانی ڈیوسس اور اس کے جانشینوں نے نہ صرف فارس پر قبضہ کرلیا بلکہ اس خاندان کے سلطان ھــــوخشتـــــر (653-585 ق م) نے بابلی حکومت کے ساتھ معاہدہ کرکے آشور کی بہت بڑی سلطنت کو شکست دی اور 612 ق م میں اس کے دارالحکومت کو تباہ کردیا۔

اُس زمانے میں کرد ''آشورا'' (آھورا) کی پرستش کرتے تھے۔ ''ھور'' کا مطلوب ہے؛ ''آگ'' اور ''آ'' کا مطلب ہے؛ ''آیا''۔ ''وہ حقیقت جو آگ سے دائمی ہے''، دائمی آگ۔ کارل ساگاں (کاسموس:صفحہ 108) کا خیال ہے کہ ''رِستے ہوئے تیل اور گیس میں آسمانی بجلی کی وجہ سے لگنے والی آگ کو ''ابدی آگ'' کا ماخذ خیال کیا گیا جو قدیم فارس کے آتش پرست مذاہب میں بنیادی حیثیت اختیار کرگئی''۔ جب بلوچوں نے توران اور مکران میں سکونت اختیار کی تو انھوں نے اپنے مذہب کو رواج دیا۔توران کی بت پرستی متروک ہوگئی۔ کرد بلوچ، دن میں تین بار آگ کی پرستش کرتے تھے۔ وہ اپنی عبادت گاہ کو ''آ ریئم'' کہتے تھے۔ جس کا مطلب ہے؛ آتش کدہ۔ آتش کدہ کے معبد کو آری وان کہتے ہیں۔ ہر جگہ شہروں اور دیہات میں آتش کدے ہوا کرتے تھے۔ حکمرانوں نے دو بڑی عبادت گاہیں کیکان (موجودہ نال) اور خضدار میں ''آرین زوراک'' اور ''آرین حلوان'' کے نام سے تعمیر کی تھیں۔ جو کوہ زوراک اور کوہ حلوان کی چوٹیوں پر بنائی گئی تھیں۔ اس عہد کی ایک اہم بات یہ تھی کہ اُس دور میں لوہے کا استعمال ہوتا تھا۔(1)

اسی طرح نیچارہ اور پندران کے علاقہ میں کئی پہاڑوں، چٹانوں اور قبرستانوں میں بھی زرتشتی آثار موجود ہیں۔ خاران، گدر اور ماشکیل میں بھی آثار اور قبریں اس مذہب کی موجودگی کی دلالت کرتے ہیں۔ کوئٹہ (شال) میں سرینا ہوٹل کی تعمیر کے دوران تہہ خانوں کی کھدائی کے وقت ایسے آثار دریافت ہوئے جن سے زرتشتی معتقدات کی نشان دہی ہوتی ہے۔(2)

بلوچ آج بھی آگ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں آج بھی آگ کی طرف پاؤں کرکے لیٹا نہیں جاتا، ہم آج بھی آگ کی طرف نہیں تھوکتے، جلتی آگ کو پھلانگنا بہت گستاخی اور بدتہذیبی تصور ہوتا ہے۔ اور ہمارے ہاں آگ کی طرف ہاتھ کا پنجہ کھول کر لعنت بھیجنے کی سختی سے

حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔(کچھ قبائل البتہ آگ کے اختیار اور طاقت میں بہت تجاوز سے کام لیتے ہیں اور غیر آئینی طور پر آگ کو چیف جسٹس بنا دیتے ہیں)۔

کردسال میں دو بار (خزاں اور بہار میں) توران ومکران سے راشن اور جانور ساتھ لے کر آتے اور کئی روز تک ان عبادت گاہوں کی پرستش کرتے ۔(3)

یہ بلوچ موت کے بعد زندگی کے قائل نہ تھے۔ وہ موت کو اہرمن سے قطعِ رشتۂ تسلسل جانتے تھے۔ وہ شروع میں مردے کو دفن نہیں کرتے تھے۔ بلکہ پتھروں یا سطح مرتفع پر چھوڑ جاتے تا کہ پرندے اور جانور اُسے کھالیں۔ دفن کرنے کا سلسلہ بہت بعد میں شروع ہوا۔ شادی کے لیے فقط طرفین کی رضامندی کافی ہوتی تھی۔ تاریخ کی کتابیں بتاتی ہیں کہ ختنے وغیرہ کی رسم نہ تھی۔ آج کی طرح، بلوغت سے پہلے لڑکوں کو مار ڈالنا ممنوع تھا۔

شروع شروع میں تو یہ خانہ بدوش لوگ تھے۔ بعد میں کہیں جا کر سکونت انہوں نے اختیار کی۔ اور کھیتی باڑی، باغبانی اور شجرکاری شروع کی۔ انھوں نے پانی کو ذخیرہ کرنے کے لیے ایسے ایسے نازک اور دشوار بندات تعمیر کیے کہ انھیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ انھیں ''گور بند'' کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ آج کی بلوچی زبان میں بھی مستعمل ہے۔ 'کردگال نامک' کے مصنف اخوند صالح کے مطابق یہ ''گور بند' 854 تا330 ق م میں تعمیر ہوئے۔ ساراوان میں وادی گزگ ۔ نرمک، رودبار۔ باڑی میں چھپر جم۔ اور جھالاوان میں سوراب سے لے کر وادی ہب تک ''گور بندوں'' کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ جو بندات بہتر حالت میں ہیں، وہ ہیں: وادی بھپو ،تو تک ،لاکوریان' سارونہ، گدر، مشکے، جیری اور ہب۔ خاران میں یہ بندات وادی راسکوہ، گر، اور سیاھان کوہ میں واقع ہیں۔

بلوچی کہن یا کاریز بھی زرتشتیوں کے دور کے طریقۂ آب پاشی اور کاشتکاری کا پتہ دیتے ہیں۔ سام پور کا ٹیلہ جو مستنگ کے کاریزات میں واقع ہے، اسی قدیم دور کی یادگار ہے۔

سردار اپنے قبیلے کے سارے فیصلے کرتا تھا۔ کرنسی نہ تھی اور ضرورت کی اشیاء اور اجناس کا باہم تبادلہ ہوتا تھا۔ ان کے ہتھیار تیر وکمان، خنجر اور کمند ہوا کرتے تھے۔

آشور کی تباہی کے بعد اس کی سلطنت کے بڑے حصے پر مادوں کا قبضہ ہوگیا اور ان کی حکومت ایران سے اناطولیہ تک پھیل گئی۔ البتہ ہوخشتر کا جانشین استاگس اپنے پیش رو کا ہم پلہ ثابت نہ ہوسکا اور اس کے عہد میں کورش دوم ھخا منشی نے بغاوت کر کے حکومت مادوں سے چھین لی۔

نویں صدی قبل مسیح میں ایرانی قبائل کے دو بڑے گروہ ابھر کر سامنے آئے؛ میدی اور پارسی۔ ساتویں صدی قبل مسیح کے اختتام تک میدیہ نے ایک طاقت ور ریاست کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط میں میدیوں کو اپنے پڑوسی پارسیوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ یہ پارسی ہخامنشی خاندان کے فرماں رواؤں کی قیادت میں ایک طاقت کے بطور ابھرے۔ کُوروشِ اعظم (559۔530 ق م) جسے سائرسِ اعظم بھی کہا جاتا ہے' کالشکر جنوب مغربی ایران (پارس) سے آندھی کی طرح اٹھا اور بابل کی عظیم سلطنت کو روندتا ہوا دریائے نیل کے ساحلوں تک پہنچا۔ اس نے نہ صرف مادوالی پہلی سلطنت پر قبضہ کرلیا بلکہ ایک طرف اپنی سلطنت کو یورپ کی سرحدوں تک وسعت بخشی اور دوسری طرف اس نے عظیم بابلی حکومت کو شکست دے کر مصر تک فتوحات حاصل کیں۔ اس نے مشرق میں خراسان سے آگے اور جنوب مشرق میں ہندوستان فتح کر لیے۔

البتہ فوج کے جس حصے کی قیادت کرتا ہوا وہ بلوچستان پر حملہ آور ہوا، اُسے بلوچستان نے برباد کر ڈالا۔ یہاں کے دشوار گزار راستوں اور قدم قدم پر زبردست عوامی مزاحمت کے باعث وہ نیست و نابود ہوگیا۔ اور اس بہت بڑی فوج میں سے صرف سائرس اور اس کے سات ساتھی زندہ بچ کر واپس بھاگ جانے میں کامیاب ہوسکے(4)۔ وہ بس، فتوحات کے سراب کا پیچھا کرتے کرتے 529ق۔م میں وسطی ایشیا میں مارا گیا۔

جھوٹی دنیا کے اس کے جھوٹے تخت پر ہخامنشیوں کی ایک دوسری شاخ کے دارا (داریوش اول) نے قبضہ کرلیا اور شہنشاہ ایران کی حیثیت اختیار کی (5)۔ (شہنشاہ: بادشاہوں کا بادشاہ)۔ اس کی سلطنت کے ڈھیلے ڈھالے بیس صوبوں میں بلوچستان بھی شامل تھا۔(6)

اس کے جانشین دارِیُوش (522۔486ق م) نے البتہ بلوچستان کو قبضے میں لے لیا۔

اور ہم سے خراج بھی لینے لگا۔سلطنتِ ہخامنشیہ کے عہد میں بلوچستان چودھویں ساتراب (ضلع) کا حصہ تھا۔(7)

داریوش نے یہ طے کیا کہ حکومت کو فردِ واحد کے ہاتھ میں مرتکز نہیں ہونا چاہیے۔اس لیے اس نے صوبوں کو چھوٹے چھوٹے چھ ضلعوں (ساتراب) میں تقسیم کر دیا۔اور ہر ضلعے میں ایک ٹیکس کلکٹر اور سمجھ دار اور تجربے کار گورنر مقرر کر دیا۔اس طرح سے سلطنت متعدد چھوٹے ساتراب میں تقسیم ہوگئی۔انھی میں سے ایک ماکا، یا، مکہ (مکران) بلوچستان تھا۔(8)

اُس نے اپنی وسیع سلطنت میں واحد کرنسی جاری کی تھی۔سونے کا یہ سکہ ''داریک'' کہلاتا تھا۔یہ تو معلوم بات ہے کہ کرنسی تجارت کی ضامن ہوتی ہے اور تجارت، اپنے لیے سڑکیں بنواتی ہے۔چنانچہ شیر شاہ سوری سے بھی کئی صدیوں پہلے دارا کی حکومت میں ان خطوں میں ہر پندرہ میل پر سرائیں اور چوکیاں قائم تھیں جہاں گھوڑے بدلنے کا انتظام رہتا تھا۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ زرتشی مذہب دارا کے عہدِ حکومت میں وجود میں آیا تھا۔

کیخسرو کے دورِ حکومت میں بلوچستان سلطنت ماکیانیہ کا ایک حصہ تھا اور بلوچوں کو کیخسرو کے لشکر کا بہادری و دلیری کی صفات سے مزّین ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔جنھوں نے کبھی بھی میدانِ جنگ میں پیٹھ نہیں دکھائی تھی۔

ریفرنسز

1-مبارک علی، ''انڈرسٹینڈنگ پاکستان''، 1992ء، پروگریسو پبلشرز، صفحہ 3

2 - جمالدینی، عبداللہ جان، پیش لفظ، محمد اشرف شاہین کی کتاب'' بلوچستان تاریخ اور مذہب 1997 ''ادارہ تدریس کوئٹہ

3-اخوند، صالح محمد، ''کردگال نامک''، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ 1994ء، صفحہ 109

4-یحییٰ امجد، ''تاریخ پاکستان، وسطی عہد''، 1997ء، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، صفحہ 56

5-فاروقی، عمادالحسن آزاد، ''مغربی ایشیا کے مسلمان''، گوتم پبلشرز لاہور، صفحہ 66

6-دل ڈیورانٹ ''آوراورینٹل...... ہیرٹیج''، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، صفحہ 355

7-دشتی، محمد اسماعیل / صادق بلوچ، ''بلوچ تاریخ اور تہذیب''، 1999ء، فضلی سنز لمیٹڈ، صفحہ 41

8-دشتی، محمد اسماعیل / صادق بلوچ، ''بلوچ تاریخ اور تہذیب'' 1999ء، فضلی سنز لمیٹڈ، صفحہ 107

سکندرِ یونانی کے مؤرخین

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ڈھائی تین سو سال قبل کے بلوچستان کے بارے میں ہماری معلومات کا ایک وسیع ذریعہ وہ تحریریں ہیں جو سکندر کی فوجوں کے ساتھ آنے والے مؤرخوں نے لکھی ہیں۔ یہ معلومات بالخصوص مکران اور لسبیلہ کے ساحلی بلوچستان کے بارے میں ہیں۔

بس دو چار فقروں میں یہ بات بھی کر دیں کہ سکندر سے دو ڈھائی سو سال قبل ہندوستان کی سرزمین پر ''مہاتما'' بدھ نمودار ہوا۔ اور اس درمیان زمان، مکان کی پھسلن پہ اپنے کرتب دکھاتا جا رہا تھا۔ مہاجرت قوموں کی بھی ہوتی رہی، گروہوں، خاندانوں اور افراد کی بھی۔ شمشیر، مالی اور جغرافیائی فتوحات بھی کرتی رہی اور عقیدوں، نظریوں کو بھی پھیلاتی رہی۔ مگر اس کا اصل مرام تو دولت مندوں کی دولت کو بڑھانا تھا۔

پارس اور ہندوستان کی دولت لوٹنے والے بڑے بڑے حملہ آوروں کی گندی لسٹ میں سکندر کا نام بہرحال نمایاں ترین ہے۔ یہ وہی سکندر ہے جسے لکھاریوں، مؤرخوں اور درباریوں نے ''اعظم'' کا ٹائٹل دے رکھا تھا۔ اللہ جانتا ہے کہ ڈاکو کبھی اعظم نہیں ہوتا۔ لٹیرا، حملہ آور، فاتح، اور جنگی جنونی کبھی اعظم نہیں ہوتا۔ البتہ تلوار بازی کے پیشے اور مالِ غنیمت پر زندہ اُس معاشرے والے سادہ اور کم مہذب عہد میں یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی کہ اُسے سکندر ''اعظم'' کہا جاتا تھا۔

وہ یونان کے شمال مشرقی حصے میں میسوڈونیا (مقدونیہ) نامی ابھرتی ہوئی قوت والے

علاقے کا باشندہ تھا۔ میسوڈونیا میں مطلق العنان بادشاہت قائم تھی جسے 359 ق م میں فلپ جیسا توسیع پسند اور فوجی امور کا ماہر حکمران ملا۔ اُس نے اپنی فوج کو آہنی ڈسپلن عطا کیا۔ اور اُسے خطرناک ترین فوجی قوت بنا ڈالا۔ اُس نے تقریباً تمام یونانی ریاستوں کو زیر کر لیا اور اسی فوج کے بل پر بعد میں اس کا بیٹا سکندر 22 سال کی عمر میں دنیا کو فتح کرنے نکل کھڑا ہوا۔

فلپ اور اولمپاس کا بیٹا سکندر ''پیلا'' کے مقام پر 356 ق م میں پیدا ہوا۔ (1) جب وہ 32 برس کی عمر میں مرا تو اس وقت تک اُس نے مالِ غنیمت کے لوٹنے کے لیے اپنی سلطنت میں میسوڈونیا اور یونان سے لے کر وہ سارے علاقے شامل کر دیے تھے۔ جن میں آج کا ترکی، لبنان، اسرائیل، اردن، مصر، لیبیا، قبرص، شام، عراق، وسطی ایشیا کے ممالک، ایران، افغانستان، بلوچستان، اور اس کے پڑوس کے دیگر علاقے، اور ہندوستان واقع ہیں۔

مجھے ڈاکو کی لوٹی ہوئی دولت کو مالِ غنیمت کہنا اچھا نہیں لگتا۔ بلوچی کا لفظ ''آوار'' بہت مناسب ہے۔ ڈاکو کو کیا تقدس حاصل ہو؟ حملہ آور کو کیوں احترام دیا جائے؟ ڈاکے کو اچھا کیوں کہا جائے؟ اور ڈاکے سے حاصل کردہ مال و دولت کو شرف کیوں دیا جائے؟ اس سارے عمل پہ پھٹکار!!

جب 336 ق م میں فلپ قتل ہوا تو تخت، سکندر کی جھولی میں تھا۔ وہ 326 ق م کے موسم بہار کے اوائل میں آج کل کے صوبہ خیبر پختونخوا کی طرف سے ہندوستان میں وارد ہوا۔ ایک منظم بادشاہ کے بطور وہ اپنے ساتھ تاریخ نویس بھی لایا تھا۔ انھوں نے جو باتیں یہاں کی دیکھیں یا سنیں، اُن سب کو قلم بند کرتے رہے۔

اُس کے انجینئروں نے دریائے کابل اور دریائے سندھ کے مل جانے کے مقام سے ذرا نیچے کشتیوں کا ایک پل تعمیر کیا جہاں سے اس کی مہیب افواج گزر کر ٹیکسلا میں اپنا استقبال کروانے کے لیے پہنچیں۔ (2)

ٹیکسلا میں وہ اپنی فوجوں کو دریائے جہلم پر ہندوستان کے بادشاہ پورس کے ساتھ گتھم گتھا ہونے والی ایک جنگ کے لیے منظم کرتا ہے۔ جہلم کا دریا پورس کی شکست کا گواہ بن جاتا ہے۔ یہی جہلم اس بات کا گواہ بھی ٹھہرا کہ سکندر کی فوجیں آگے جانے سے انکار کرتی ہیں اور وطن کے لیے

اداس ہو کر سکندر کو بھاری دل کے ساتھ مجبور کرتی ہیں کہ وہ گھر واپسی کے طویل سفر میں اُن کی قیادت کرے۔ جہلم دریا کے دونوں کنارے، ان وحشی افواج کے بھاری قدموں کی خوف ناک آہٹوں کے بھی گواہ ٹھہرے جو اُس کے ساتھ ساتھ نیچے چلے۔ اور یہی دریا اُن 2000 کشتیوں کے فلیٹ کی شاہراہ بھی ٹھہرا جس میں سکندر کے بقیہ فوجی بیٹھ کر وطن واپس ہوئے۔ یہ 326 ق م کے اواخر کا زمانہ تھا۔ واپسی کے اِس سفر میں جہلم، چناب اور سندھ کے دریاؤں کے پیچ وخم سکندر سے شہر شہر فتح کرواتے گئے۔ مگر............فُل سٹاپ، اس لیے کہ آگے تو بلوچستان تھا!

سکندر نے اپنے ایک ایڈمرل نیرکوس (Nearchos) کو حکم دیا کہ وہ دریائے سندھ کے دہانے سے لے کر بحیرۂ عرب (بحیرہِ بلوچ) اور خلیج فارس کے ساحل کے ساتھ ساتھ جائے۔ اور پھر دجلہ وفرات سے ہوتے ہوئے سُوسا (Susa) تک سفر کرے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ دریائے سندھ کے دہانے سے لے کر سمندر اور ساحلی علاقوں تک کا جائزہ لے اور ہندوستان کو میسو پوٹیمیا کے ساتھ دریائی علاقے سے ہوتے ہوئے ایک سمندری راستہ کھول دے۔ نیرکوس نے یہ سفر 325 اور 324 ق م کی سردیوں میں کیا۔ اس نے اس علاقے کے بارے میں جو تحریریں لکھیں، وہ ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔ اس کی ان تحریروں کے ذریعے ہمیں بلوچستان کے اُس حصے کی اُس زمانے کی سماجی اور معاشی زندگانی کے بارے میں بڑی معلومات ملتی ہیں۔

وہ اپنے پیشرو اور ہم عصر جغرافیہ دانوں کی طرح بلوچوں کو Ichthyophagi (ماہی خور) کا نام دیتا ہے۔ اُس دور کی ہماری ماہی گیری کچھ یوں تھی: ''وہ اپنے جال سمندر میں پھینکتے ہیں اور مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ یہ جال کھجور کے پتے کو بل دے کر بنائے جاتے تھے''۔(3)

وہ بڑی مچھلیوں کو اچھی طرح دھوپ میں سُکھاتے تھے۔ پھر وہ انھیں پیس لیتے تھے اور ان کا آٹا بنا کر روٹی تیار کرتے تھے۔ وہ لوگ اپنے مویشیوں کو سبزہ نہیں دیتے تھے۔ اس لیے کہ سبزہ یا تو موجود نہ تھا، یا کافی نہ تھا۔ اس لیے وہ اپنے مویشیوں کو بھی مچھلی کا آٹا دیتے تھے۔ خود بھی ماہی خور، اور اُن کی بھیڑ بکریاں بھی ماہی خور!

نیرکوس کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ماہی خور لوہا استعمال نہیں کرتے تھے۔ البتہ،

اُس زمانے میں یہاں آگ موجود تھی۔ لہٰذا اُن کے پاس جو بھی ہتھیار تھے، خواہ تیر ہو یا نیزہ، وہ اُس کی اَنی کو محض آگ میں سخت بناتے تھے اور چقماق کے پتھر کے ساتھ اسے تیز کرتے تھے (4)۔ یہ لوگ نوک دار پتھر کو بھی چاقو اور دیگر اوزار کی طرح استعمال کرتے تھے۔ گو کہ آج بھی بلوچ چرواہے چاقو پاس نہ ہو تو ہنگامی حالت میں نوک دار پتھروں سے اپنے مویشی ذبح کرتے ہیں مگر آج کی بات اور ہے۔ آج لوہا موجود ہے، جب کہ ہمارے اُن ساحلی اجداد کے ہاں لوہا ابھی متعارف نہ ہوا تھا۔

مکران کے ساحلی علاقوں کے لوگ دیو ہیکل مچھلیوں کی ہڈیوں کو عمارتی سامان کے بطور استعمال کرتے تھے۔ ان کا بالائی طبقہ جھگیوں میں رہتا تھا۔ اور سمندر کی کسی بڑی مچھلی کی ہڈیوں کو شہتیر اور کڑیوں کے بطور استعمال کرتا تھا۔ چپٹی ہڈیاں ان کی جھگی کا عظیم دروازہ بنتیں۔

سکندر کے اس مشہور بحری افسر اور سمندری سفر کے رہنما، نیرکوس نے بلوچوں کی بہادری اور سخت کوشی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا:

''اُن کا اسلحہ چھ ہاتھ لمبے نیزے تھے۔ جن کا پھل لوہے کے بجائے لکڑی کا تھا۔ لیکن یہ لکڑی لوہے سے زیادہ مضبوط تھی......۔ انھی نیزوں سے انھوں نے ہزاروں مقدونی سپاہیوں کے سینے چھید دیے تھے''(5)۔

وہ مزید کہتا ہے: ''ان کے جسم اور چہرے لمبے لمبے بالوں سے ڈھکے ہوتے تھے۔ وہ تیز اور لمبے کانٹوں کی مدد سے مچھلیوں اور درختوں کی شاخوں کو کاٹتے تھے۔ ان کا لباس حیوانات اور بڑی مچھلیوں کی کھال سے بنا ہوا تھا......''(6)۔ (مطلب یہ کہ مہر گڑھ کا کاٹن بلوچستان کے مغربی کنارے تک 9 ہزار سال تک بھی نہ پہنچ سکا تھا)۔

بہرحال آگ کی موجودگی اور استعمال خود ایک زبردست ترقی یافتہ سماج کی عکاسی کرتی ہے۔ نیرکوس نے اناج کی معمولی کاشت کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اس طرح زراعت، ماہی گیری اور آگ کا استعمال ایک اچھے خاصے ترقی یافتہ سماج کی عکاسی کرتے ہیں۔

چھ دن ٹھہرنے کے بعد انھوں نے ''مالان کی طرف بحری سفر کا آغاز کیا......''۔

سکندر نے اپنے ایک اور جرنیل کراٹی راس کو وادی سندھ سے ہلمند کے راستے روانہ کر دیا تاکہ وہ علاقے کا سروے کرتا ہوا پارس میں سکندر سے آن ملے۔ کراٹی راس درہ مولا سے گزر کر خضدار کے راستے گیا۔ کاش کہ ہمیں اس کا بھی کوئی روزنامچہ ملتا کہ ہم اُس دور کے جھالاوان اور اس کے اڑوس پڑوس کے علاقوں کے علاوہ ایرانی بلوچستان کے سماج کے بارے میں بھی زیادہ معلومات حاصل کر سکتے۔

بہرحال سکندر کی واپسی کے راستے پر بحیرہِ بلوچ کا طویل ساحل اور بلوچستان واقع تھا۔ سکندر کے پاس کل ایک لاکھ بیس ہزار فوج تھی۔ اُس نے اپنی فوجوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ اس نے نیرکوس کی قیادت میں آٹھ ہزار آدمیوں پر مشتمل ایک حصہ، ساحل کے ساتھ ساتھ بحری جہاز پر روانہ کر دیا۔ 90 ہزار کو کراٹرس کی سربراہی میں عام راستے پر روانہ کر دیا اور بقیہ پچیس ہزار کی خود قیادت کرتے ہوئے وہ بلوچستان کے صحرا کے پاس مغرب کی طرف روانہ ہوا۔ کامل القادری نے لیمب کے حوالے سے لکھا کہ مقدونیہ کے بحری جہازوں کی ساخت ایسی تھی کہ وہ تین روز سے زیادہ کے لیے پانی یا خوراک اپنے ساتھ نہ لے سکتے تھے۔ گویا پورے سفر کے سلسلے میں یہ ضروری تھا کہ ہر تیسرے دن ساحل پر کم از کم اگلے تین دنوں کے لیے راشن پانی مہیا کیا جاتا رہے۔ مکران میں خشکی پر سفر کی ایک اہم غرض یہ تھی۔ اور راشن پانی کی سپلائی کا یہ فرض سکندر نے اپنے سر لیا۔ (7)

اس گدروشیائی صحرا میں (لسبیلہ سے کرمان تک کا علاقہ) ساٹھ دن کا سفر اس کی فوجوں کے لیے مکمل تباہی کا سفر ثابت ہوا۔ (اب معلوم نہیں کہ گدروشیا نام کا ''گدر'' لفظ سے کوئی تعلق ہے یا پھر یہ یونانیوں کا دیا ہوا نام ہے)۔ بہرحال گدروشیا کی تباہ کن گرمی اور پانی کی قلت نے بے شمار اموات اُسے تحفہ کر دیں۔ بالخصوص جانور تو بڑی تعداد میں، سورج سے جلتے بلوچستان کی آگ بنی ریت پر پک پک کر گرتے رہے۔ فاصلے لمبے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پانی نہ ملتا تب بھی مصیبت تھی اور ملتا تب بھی موت تھی۔ نہ ملتا تو پیاس مار دیتی، ملتا تو بے قابو ہو کر بہت زیادہ پینے سے موت آ جاتی۔ راشن سخت کم تھا لہٰذا سپاہی لوگ جان بوجھ کر خچر اور گھوڑے مار دیتے اور بہانہ کرتے کہ تھکاوٹ اور گرمی نے مار دیا۔ اگر اوپر والوں کو پتہ چلتا بھی تو وہ خود کو بے خبر ظاہر کرتے۔ سپاہی

بیمار پڑتے تو اپنے حال پر چھوڑ دیے جاتے۔

اور جب دور پہاڑوں پر بارش ہوتی تو سیلابی ندیاں (جہاں راستہ بھی تھا پڑاؤ بھی)، سکندری فوجوں کا صفایا کرتیں۔ وجہ یہ ہے کہ سارا راستہ انہی ندیوں کے اندر چلا جاتا اور پڑاؤ بھی ظاہر ہے کہ وہیں یا آس پاس ہوتی تھی۔ بالخصوص کراچی اور اورماڑہ کے درمیان اسے شدید مشکلات پیش آئیں۔ بلاشبہ اس کی فوجوں کو پورے ایشیا میں اتنی مشکلات کا سامنا نہ ہوا جتنی کہ اسے گدروشیا میں پیش آئیں۔ (8) اس کے مؤرخوں کے مطابق، مارچ کرتی ہوئی فوج کی مصیبت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ڈسپلن گراوٹ کی انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ سپاہی کھلے عام شاہی سٹوروں پر ٹوٹ پڑتے۔ خوراک کے لیے وہ باربرداری والے جانوروں کو کاٹ پھاڑ ڈالتے اور ایندھن سے لدی ہوئی گاڑیوں کو جلا ڈالتے۔ اُن سے اپنا غنیمت اور لوٹ کا مال بھی نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ وہ اسے وہیں پھینکتے جاتے۔ انھیں بادشاہ کی جانب سے سزائے موت کے بجائے، بھوک سے موت فوری نظر آتی تھی۔ (9)

بہرحال سکندر گرتے پڑتے دریائے ہنگول کے پاس پہنچا جہاں اس نے اپنی سمندری فوجوں کے لیے راشن جمع کرنے کی خاطر قیام کیا۔ مگر یہاں سے آگے سمندری فوج کے ساتھ رابطہ رکھنے کی خاطر وہ ساحل کے ساتھ ساتھ اپنا سفر جاری نہ رکھ سکا۔ مالان کوہ کے سلسلے نے اس کا راستہ روک لیا۔ چنانچہ مجبوراً اسے اندرونی علاقے سے جانا پڑا۔ وہ ہنگول کے ساتھ ساتھ مغرب کی سمت چل پڑا۔ ہنگلاج کے مقدس دربار کے اردگرد موجود بڑے بڑے پہاڑوں میں سے اس نے اپنا راستہ بنایا۔ وہ چالیس میل تک دریائے ہنگول کے کناروں کی قدم بوسی کرتا رہا اور دریائے پرکان سے اُس کے آن ملنے تک چلتا رہا۔ یہ دریا ہنگول سے مغرب کی طرف جاتا رہا۔ اب سکندر کو پہلی بار ''مالان'' سے نجات ملی اور اس نے مغرب کی طرف سمندر کی جانب اپنے لشکر کا رخ موڑ دیا۔ سارے علاقے میں ریت کے ٹیلوں کے علاوہ کچھ نہ تھا اور اس کی فوجوں کے لیے راشن اور پانی نایاب، اور اوپر سے شدید گرمی۔ بلوچستان نہ تو غاصب کو سایہ دینے پر آمادہ ہوتا ہے اور نہ پناہ گاہ میسر کرنے پہ تیار۔

گو کہ پرکان کا راستہ اُسے دریائے بسول تک لے جاتا مگر وہ راستہ بھول کر پسنی کے قریب جا پہنچا۔ اس نے پسنی کے ساحل کے ساتھ ساتھ دو دن تک سفر جاری رکھا اور کرمان کی مشہور شاہراہ تک پہنچ گیا۔ وہ ساحل کو دریائے دشت کے قریب ہی چھوڑ سکتا تھا اور وادی باہو میں داخل ہو سکتا تھا جو اسے گدروشیا کے دارالحکومت بمپور تک لے جاتا تھا۔ مارچ کے اس حصہ نے تقریباً ایک ماہ کا عرصہ لے لیا۔ (10)

بمپور میں سکندر کو اپنے آدمیوں کے لیے خوراک اور پانی مل گیا۔ اور وہ سامان پا کر دوبارہ روانہ ہوا۔ بالآخر بہت زیادہ مشقتیں اور تکالیف جھیلنے کے بعد سکندر ''اعظم'' اپنی باقی ماندہ تباہ حال افواج کو بورا، یا، بہرہ ''فہرج'' (موجودہ ایران شہر) کی طرف نکال کر لے گیا۔ (11)

وہ 323 ق م میں بابل میں داخل ہوا۔ مشکلات اور تھکاوٹ سے چور، زخموں سے بھرا بلوچستان کے مچھروں سے چھدا اور زیادہ شراب نوشی سے بدحال، وہ بخار میں مبتلا ہو کر بستر پر پڑ گیا۔ اور دو دن کے اندر اندر شہر بابل میں مر گیا۔ سکندر جو ابھی 33 سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔

اس سفر میں سکندر کی فوج میں سے پچیس ہزار کے قریب راستے میں مر گئے۔ ان میں سے بیشتر صحرائے مکران میں مرے تھے۔ صحرائی گرمی، پیاس اور پانی کی نایابی نے اس فوج کو تباہ کرنے میں یقیناً اہم کردار ادا کیا مگر بلوچستان کے انسانوں نے بھی نے جگہ جگہ ان پر چھاپہ مار حملے کیے رکھے۔ کیوں کہ یہ ان کی معلوم تاریخ میں ایک لازمی صفت رہی ہے۔ (12)

سکندر اپنی فتوحات میں علاقوں کو تباہ و برباد نہیں کرتا تھا۔ وہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو ذبح کرنے کے بجائے روزانہ سونے کا انڈہ ہتھیا لینے کا قائل تھا۔ مال حاصل کرنے کے لیے وہ لوٹ مار، گھیراؤ جلاؤ قطعاً نہیں کرتا تھا۔ وہ مفتوح لوگوں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرتا تھا۔ وہ ان کے مقامی حاکم مقرر کرتا تھا۔ اس کے یونانی آرکی ٹیکٹ نئے نئے شہر بساتے، اس کے ساتھ لائے ہوئے جغرافیہ دان اور سروے والے مقبوضہ علاقوں کے مفصل نقشے تیار کرتے تھے۔ موجودہ لسبیلہ کے علاقے میں اس نے ''سکندریہ'' نامی شہر بسایا۔ اس نے پارس جیسی عظیم سلطنت کے طاقت ور بادشاہ (داریوش سوئم) کی قوت کو تباہ کر کے اس کی ساری زمین اور القابات خود لے لیے۔

اس نے میسوڈونیا کے پہاڑوں سے لے کر مصر کے صحراؤں تک، اور برف پوش ہندوکش اور وسطی ایشیا کے میدانوں سے لے کر بلوچستان کے تباہ کن علاقے تک ایک بہت بڑے خطہ کو اپنی گزرگاہ تو بنا لیا مگر ساتھ ساتھ اس نے اس پورے انجانے خطے کے نقشے بنا لیے، شہر اور بازار تعمیر کر کے تجارتی راستے کھول دیے اور مشرق و مغرب کے درمیان خیالات کے تبادلے کو تقویت بخشی۔ وہ اپنے میسوڈونیا والے فوجیوں کی لاشیں اعزاز کے ساتھ دفن کراتا تھا۔ اُن کے خاندانوں کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیتا تھا۔ اُس کے حملوں اور فتوحات نے نسلوں کو باہم مخلوط کرایا، قبائل یہاں سے وہاں جا بسے، نظریات و کلچر کی موجیں باہم لین دین کرتی گئیں اور مشرق و مغرب کے درمیان ایک مضبوط و توانا رشتہ استوار ہوا۔ وہ واحد دس برس جو سکندر کو جوانی سے موت تک لائے، اُسے معلوم تمدن کی سرحدوں کے پار تک لے گئے۔ یونانیت جیسے ترقی پسند عنصر کے عہد میں، شہروں نے بڑی تیزی سے وسعت اختیار کی، شہر تجارت اور ترقی یافتہ صنعت کے مراکز بن گئے۔ علم و دانش کے چرچے بڑھے اور تہذیبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔

ریفرنسز

1- Crindle J.W. "The invasion of India by Alexander the Great"-1992-Indus Publication, Karach page No.15

2- ایضاً صفحہ 4۔

3- Oddone Longo, A Trip Among Fish Eaters نیوز لیٹر آف بلوچستان۔ نیپلز، 1987,4، صفحہ 12۔

4- ایضاً، صفحہ 16۔

5- دشتی، محمد اسماعیل/صادق بلوچ، ''بلوچ تاریخ اور تہذیب''، 1999ء، فضلی سنز لمیٹڈ۔ صفحہ 110

6- دشتی، محمد اسماعیل/صادق بلوچ، ''بلوچ تاریخ اور تہذیب''، 1999ء، فضلی سنز لمیٹڈ۔ صفحہ 110

7- کامل القادری ''قدیم بلوچستان 1971ء''، بولان بک کارپوریشن کوئٹہ، صفحہ 42

8- Crindle......The Invasion ......، صفحہ 173

9- رائس، ای ای، ''الیگزنڈر دی گریٹ'' 1997ء، Sutton پبلشنگ لمیٹڈ۔ صفحہ 81

10- Crindle......The Invasion of India by Alexander، تعارف، صفحہ xxix۔

11- دشتی، محمد اسماعیل/صادق بلوچ، ''بلوچ تاریخ اور تہذیب'' 1999ء، فضلی سنز لمیٹڈ۔ صفحہ 110

12- یحییٰ امجد، ''وسطی عہد۔۔۔''، صفحہ 163۔

اشوک کے آثار

(232-304 ق م)

قدیم بلوچستان کے بارے میں معلومات کا ایک بڑا ذریعہ اشوک اور اُس کی حکمرانی بھی رہے۔

سکندر کی موت کے بعد اُس کے اپنے جرنیل اِس سلطنت پر قبضہ کرنے کے لیے آپس میں جنگیں لڑ رہے تھے۔ بالآخر سارے جرنیل اس فیصلے پہ پہنچے کہ سلطنت کو آپس میں بانٹ لیا جائے۔ جیسے ملک نہیں کیک ہو۔ چنانچہ مشرقی حصہ (مادستان، پارس، توران، مکران، زابلستان اور کابلستان) 310 ق م میں سکندر کے مشہور جرنیل سیلیوکس نیکاٹر کو ملا۔ اس نے صبر وشکر کے بجائے مزید پھیلنا چاہا اور ایک بہت بڑی فوج لے کر ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ مگر مگدھ کے حکمران چندر گپت نے اُسے بری طرح شکست دے دی۔ (اسی چندر گپت کی ماں کا نام مُرا تھا جس کی وجہ سے اس خاندان کو موریہ خاندان کہتے ہیں)۔(1)

شکست خوردہ سیلیوکس کو صلح کرنی پڑی۔ صلح کی شرائط کے مطابق یونانی جرنیل نے اپنی بیٹی چندر گپت موریہ سے بیاہ دی اور افغانستان و بلوچستان بطور تاوان چندر گپت کو دے دیے (2)۔ کہتے ہیں کہ اس یونانی حسن کے لیے چندر گپت نے 500 ہاتھی اپنے شکست خوردہ سسر کو تحفتاً دے دیے۔ آج کا دور ہوتا تو چندر گپت اور سیلیوکس دونوں میں سے ایک کو تو اپنا مذہب بدلنا پڑتا۔ ورنہ شادی ناممکن ہوتی۔۔۔ مگر اُس وقت شاید منظّم مذہب کا دور موجود نہ تھا۔ یا پھر اُس مذہب کا مُلّا

مضبوط نہ تھا۔اوراُس کی پشت پرکوئی طاقتورقوت نہ تھی۔

اِس بات پہ توجہ دینی چاہیے کہ اتنی دُور سے چندر گپت بھلا بلوچستان کو کیا چلا سکتا تھا۔ (اِسے تو قریب کے کراچی اوراسلام آباد سے نہیں چلایا جا سکا ہے!!)۔ چنانچہ ہمارے لوگ، اپنے پہاڑوں کے اندر آزادانہ ایک سادہ انسانی زندگی بسر کرتے رہے۔ گزر بسر وہی مویشی بانی اور کاشتکاری تھے۔

چندر گپت بیس برس سے زیادہ عرصہ تک حکومت کرنے کے بعد 296 ق م میں مرگیا۔ اس کی موت کے بعد، اور بلوچستان سے بہت دور اُس کا بیٹا بندوسار (296-273 ق م) تخت نشین ہوگیا۔ اس نے بھی باپ کی طرح 24 برس تک حکومت کی۔ چانڑکیہ ہی اس کا مشیر تھا۔ چانڑکیہ' ہندوستان کا میکاولی تھا۔ سازشوں، مہارتوں اور جوڑ توڑ کا بادشاہ۔ اُس کے دو تین اقوال سنیے تو اندازہ ہوجائے گا کہ بادشاہ ظالم کیوں ہوا کرتے تھے:

* کسی کو زیادہ ایماندار نہیں ہونا چاہیے۔ وہی سب سے پہلے شکار ہوگا۔
* سانپ خواہ زہریلا نہ بھی ہو تو بھی اُسے زہریلا ہونے کا دکھاوا کرنا چاہیے۔
* ہر دوستی کے پیچھے ایک ذاتی مفاد ہوتا ہے۔

پتہ نہیں حاکموں کے مشیر اِس قدر سیڈ اِسٹ کیوں ہوتے ہیں۔ چانڑکیہ سے لے کر کنفیوشس تک اور وہاں سے لے کر ایوب خان کے مشیروں تک سب کے سب دو پیازے بہت بدتہذیب ہوتے ہیں۔

بندوسار نے بھی بلوچستان پہ کوئی حکومت نہ کی اور نہ کوئی اثر ڈالا۔

البتہ، دوسرے پڑوسی علاقوں اور قوموں کی طرح ہم پہ بھی اُس کے بیٹے اشوک نے اثر ڈالا۔ اور ایسا فوجی زور سے نہیں بلکہ ایک اور طریقے سے ہوا۔

اشوک کے جوہر اُس وقت کھلے جب اُس کے باپ بندوسار کے دور میں ٹیکسلا میں بغاوت ہوئی تھی۔ اُس نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے اپنے بیٹے اشوک کو ایک بڑی فوج کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اشوک نے بڑی کامیابی کے ساتھ حالات پر قابو کرلیا۔ جب وہ شہزادہ تھا تو اس نے

ٹیکسلا میں وائسرائے بن کر وہاں کے بلوچ علاقوں پر حکمرانی کی تھی۔(3)

بہر حال، بندوسار کی موت کے بعد اس کا بیٹا اشوک 273 ق م میں تخت نشین ہوا۔ سنسکرت میں ''اَ'' کا مطلب ہے؛ ''بغیر''۔ اور ''سوکا'' کا مطلب ہے؛ ''غم''۔ یعنی کوئی غم نہیں، کوئی پریشانی نہیں۔

موریا خاندان میں اشوک، پوری ہندوستانی تاریخ میں سب سے عظیم اور نامور حکمران ہوگزرا ہے۔ اس کی سلطنت میں آج کا سندھ، پنجاب، خیبر پختونخواہ، شمال میں افغانستان اور بلوچستان، اس کے علاوہ دور دراز بنگلہ دیش، آسام، کیرالا اور آندھرا شامل تھے۔ مگدھ (آج کا بہار) اُس کا دارالحکومت تھا۔ یعنی اشوک کی بادشاہی میں پورا شمالی اور وسطی ہند شامل تھا اور اس کی یہ سلطنت وسطی ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے 38 برس تک حکومت کی۔ حسنِ تدبیر اور ملکی سرحدوں کی نگہبانی کی صلاحیتوں کے باوجود بنیادی طور پر اشوکا کی حکومت بھی اپنے دادا کی طرح ظلم پر قائم تھی۔ (بادشاہت ظلم کے بغیر کب اور کہاں قائم رہ سکی ہے؟)۔

اشوکا نے فتوحات کے لالچ میں کالنگا کی جنگ شروع کر دی۔ کہتے ہیں کہ جس وقت جنگ ختم ہوئی تو اشوک شہر کا دورہ کرنے نکلا۔ مگر اُسے وہاں صرف جلے ہوئے مکان اور ہر جگہ بکھری لاشیں ہی نظر آئیں۔ اس منظر نے اُسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور وہ یہ مشہور خود کلامی چیخا:

''یہ میں نے کیا کر دیا؟ اگر فتح یہ ہے تو پھر شکست کیا ہے؟ کیا یہ فتح ہے یا شکست؟ کیا یہ انصاف ہے یا بے انصافی؟ کیا یہ بہادری ہے؟ کیا معصوم بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا بہادری ہے؟ کیا میں ایسا سلطنت کو توسیع دینے کے لیے کرتا ہوں یا شان وشوکت کے لیے، یا دوسروں کی سلطنتوں کی تباہی اور اپنے طمطراق کے لیے؟ کسی نے اپنا شوہر کھویا، کسی نے باپ، کسی نے بچہ، کسی نے پیٹ کا بچہ...... لاشوں کا یہ ملبہ کیا ہے؟ کیا یہ فتح کی علامتیں ہیں یا شکست کی؟ یہ گدھ، کوے، اور عقاب موت کے پیغامبر ہیں یا بدی کے؟''

تب اُس نے 260 ق م میں بدھ مذہب اختیار کیا' راہبانہ لباس پہن لیا اور بدھ مذہب

کی تعلیمات کے مطابق شکار اور گوشت خوری سے پرہیز شروع کر دیا...... وہ ہر ذی روح سے شفقت اور نرمی کے سلوک کی تلقین کرتا تھا۔ بدھ مذہب سے متعلق اس کی تحریریں ستونوں پر کندہ کی گئیں۔

اُس نے بھی سارے بادشاہوں کی طرح خود کو مذہبی نام دیا: ''دیوتاؤں کا محبوب''۔ یہ بدھ مت کا بہت جوشیلا پیروکار تھا۔ اس نے بدھ مت کی تبلیغ و ترویج کی زبردست کوشش کی۔ مگر ایسا کرتے ہوئے اس نے جبر سے قطعاً کام نہ لیا۔ وہ انتہائی رواداری برتنے والا بنا (؟)۔ وہ لوگوں کے دلوں دماغوں کو جیت کر انھیں اپنے دین میں شامل کرتا تھا۔ اشوک کو مہاتما بدھ کے بعد بدھ مت میں سب سے اونچا درجہ حاصل ہے۔

اشوک نے اپنی پوری سلطنت میں ریڈیکل تبدیلیاں کیں۔ اس سلطنت میں ریونیو جمع کرنے پہ بہت زور دیا گیا۔ جس کی خاطر کسانوں کی بڑے پیمانے پر آبادکاری کی گئی۔ اپنے وسیع تعمیراتی منصوبوں کی تکمیل اور تجارت کی سرپرستی کے لیے اشوک نے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس نے بدھ مت کو ریاست کا مذہب قرار دے کر برہمنوں کے اقتدار و اثر کو کاری ضرب لگا دی۔ معلوم نہیں کہ یہ اُس کا اثر ہے یا دوسری وجوہات تھیں کہ بدھ مت بلوچستان میں موجود رہا۔ بلوچستان میں بعض مقامات پر بدھ مت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اور ابھی تک بلوچستان میں سنائی جانے والی فوک داستانوں میں بدھ مت کے اثرات بڑے پیمانے پر ملتے ہیں۔(4)

بلوچستان میں بہت سے علاقوں میں ''گجاری'' جاتی اور ہندوؤں کی مستقل کالونیاں موجود ہیں جن میں کچھ کشان کے عہد میں اور کچھ گپت کے زمانے میں آباد ہوئے (5)۔ بلوچستان میں بدھ مت کے آثار چھلگری اور تمبو میں دیکھے گئے ہیں۔ تمبو میں بدھ مذہب کی مہر بھی ملی ہے۔(6)

'کردگال نامک' کے مطابق موجودہ بلوچستان کا وہ علاقہ جو بولان کے پہاڑوں کے مشرق میں واقع ہے اور جسے کچھی کا علاقہ کہا جاتا ہے، وہاں بدھ مت کے پیروکار رہتے تھے۔ مگر باقی بلوچستان یعنی مشرقی سلیمانی قبائل، توران اور مکران کے لوگوں نے بدھ مت قبول نہیں کیا۔

یہ عجیب و غریب دھرم ہے۔ مشہور و معروف دانش ور اور گوشہ نشین شہزادہ مہاتما بدھ کے

مذہب کو نسلِ انسانی کے تقریباً نصف حصے نے اپنا رکھا ہے۔ سدھارتا نامی یہ دانش ور نیپال کے پہاڑوں کے دامن میں کپل دستو نامی سلطنت کے حکمران سدھودانہ کا بیٹا تھا۔ وہ 622ق م میں پیدا ہوا۔ وہ کوروش اور داریوش کا ہم عصر تھا۔ اس نے برہمن معلمین سے تعلیم حاصل کی اور غور و فکر میں لگ گیا۔ والد نے 16 برس کی عمر میں ایک باکمال شہزادی ''گوپا'' سے اُس کی شادی کر دی۔ اس کے علاوہ بھی شہزادے کی دو اور بیویاں تھیں۔ کنیزوں کا لا تعداد ریوڑ بھی اس کی ''خدمت گاروں'' میں شامل تھا۔ اسی انداز میں رہتے ہوئے اُسے 29 برس ہو گئے کہ ایک روز باہر جاتے ہوئے اس نے ایک لاغر و ناتواں بوڑھے شخص کو دیکھا جس کا سر گنجا تھا اور جس کے اعضا ہل رہے تھے۔ وہ زخموں سے بھرا ہوا تھا۔ پھر اس نے ایک تابوت کی لاش کو دیکھا جس کے گرد متوفی کے عزیز اور دوست رو رہے تھے۔ اس نے اِس دکھ بھری زندگی پہ افسوس کیا جو ایک خواب اور بربط کی آواز کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس نے زمین پر افسوس کیا جو غم کی وادی ہے، جو دکھ درد سے لبالب بھری ہے۔ تب سدھارتھ نے دنیا سے کنارہ کشی کرنے کا ارادہ کر لیا اور اپنے محل، بیویوں، بچوں (وہ بیٹا بھی جو تھوڑی دیر پہلے پیدا ہوا تھا) کو چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اور خود کو زبردست چلّوں اور کفاروں کے تابع کر دیا۔ بھوک، بیماری، گرمی، سردی اور طوفان برداشت کیے۔

وہ چھ سال کی نفس کشی اور سختیوں کے بعد بھی سچ کو دریافت کرنے میں ناکام رہا۔ مگر وہ گیان میں مصروف رہا۔ اس نے بالآخر دلچسپ دریافتیں کر لیں۔ وہ بُدھ (عارف) بن گیا۔ اس کے گیان میں چار سچائیاں شامل تھیں: تکلیف، درد کی پیدائش، درد سے نجات اور اس کو ختم کرنے کے ذرائع، جس سے لافانی خوشی حاصل ہوتی ہے۔

اس نے یہ بات بتائی کہ بلاتخصیص تمام جاندار اذیت اور تکلیف کے تابع ہیں۔ وہ خود کو مہاتما بدھ یعنی ''روشن خیال'' کہتا تھا۔ اس نے 36 برس کی عمر میں سرِعام تبلیغ شروع کی۔ وہ زرد رنگ کا لبادہ پہنتا تھا، سر منڈواتا تھا اور ہاتھ میں پیالہ رکھتا تھا۔ اس نے تقریباً 44 برس سفر کیا اور دور دراز جا کر لوگوں اور شہزادوں کو اپنے مذہب کی طرف راغب کیا۔ اس کی زندگی کے اہم مقامات (اجودھیا، گایہ اور راج گڑھ) اب اس کے پیروکاروں کے لیے زیارت گاہیں ہیں۔ اُس

نے اپنی آخری رات تبلیغ میں گزار دی۔ اور اپنے شاگردوں کو الوداع کہنے کے بعد گیان میں بیٹھ گیا۔ اور اسّی برس کی طویل عمر میں، سال کے درخت کے نیچے کنج میں بیٹھے ہوئے فوت ہو گیا۔ جہاں اس کے بااعتماد چیلے آنند نے اس کے لیے بستر تیار کر دیا تھا۔ اس کی راکھ کو ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں ضلع گورکھپور کے ''کیسیا'' میں دفن کر دیا گیا۔

مہاتما بدھ ہندوؤں کے رسم و رواج اور تقریبات سے الگ رہا۔ اس نے برہمن رہبانیت کو ہٹا دیا، قربانیوں کے ڈرامے بند کر دیے اور دیوتاؤں کو بے اختیار کر دیا۔ وہ سنسار سے باہر کسی پرآتما کو نہیں مانتا تھا۔ اُس کے نزدیک نہ بھگوان کا وجود تھا اور نہ ہی دیوی دیوتا کا۔ اس کے نزدیک سنسار میں ہر طرف دکھ ہی دکھ ہے۔ اور اس دکھ کا سبب یہ ہے کہ انسان ہوس کا غلام ہو گیا ہے۔ طاقت کی ہوس، مال و دولت کی ہوس، عیش و عشرت کی ہوس، جنسی لذتوں کی ہوس۔ بدھ ہوس یعنی نفسانی خواہشوں کا دشمن تھا۔ لہٰذا نہ تو ہوس کی پرستش کی جائے اور نہ ہی اِس کو مکمل تیاگ دیا جائے۔ درمیانہ راستہ ہی ٹھیک ہے۔ یہ بیچ کا راستہ ''سچائی'' کا راستہ ہے۔ اس راستے کی آٹھ شرطیں ہیں: مناسب خیالات، مناسب ارادے، مناسب کلام، مناسب کردار، مناسب کسب، مناسب جہد، مناسب حافظہ اور مناسب دھیان۔ سچ بولنا، چوری نہ کرنا، دوسروں کے مال میں خیانت نہ کرنا، نہ دوسروں کے مال پہ قبضہ کرنا، پرائی بہو بیٹیوں پر للچائی نظریں نہ ڈالنا۔ یہ ان ''مناسبات'' کی عملی شکلیں ہیں۔(7) یہ حیران کن بات ہے کہ فطرت اور ماحولیات کا جتنا احترام بدھ مت کرتا ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔

برہمن کی چودھراہٹ کے خلاف یہ مذہب پورے ہندوستان، سیلون، برما، سیام، جاپان، چین، کوچن، چین منگولیا، منچوریا، تبت اور مشرقی جزائر میں پھیل گیا۔ بلوچستان میں اس مذہب کے اثرات کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ کندابیل (گنداواہ) کو تو اس کے ایک مرکز کی حیثیت سے بتایا جاتا ہے۔

اشوک 232 ق م میں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد موریا خاندان زوال کا شکار ہو گیا۔ اور جنوب مشرقی ایران (بلوچستان) سے اس کی عمل داری کا خاتمہ ہو گیا۔

ریفرنسز

1۔ مارسڈن۔ ای/خلیفہ عمادالدین۔ ''تاریخِ ہند''۔ 2005ء۔ بک ہوم لاہور۔ صفحہ 60

2۔ چانڑکیہ، اچاریہ کوتلیہ/ذبیح محمد اسماعیل۔ '' ''ارتھ شاستر'' (مقدمہ)۔ 1991ء۔ پی سی ایچ ایس، کراچی۔ صفحہ 39

3۔ نہرو، جواہر لال۔ ''تاریخ عالم''۔ صفحہ 203

4۔ نصیر، گل خان۔ ''بلوچی رزمیہ شاعری''۔ 1979ء۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، صفحہ 14

5۔ سید، عبدالقدوس۔ ''ٹرائبل بلوچستان 1990ء''، فیروزسنز لاہور، صفحہ 50

6۔ بلوچ، سردار خان۔ ''اے لٹریری ہسٹری آف دی بلوچ''۔ جلد اول۔ 1977ء۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ صفحہ 401

7۔ سبطِ حسن۔ ''پاکستان میں تہذیب کا ارتقا''۔ صفحہ 119

مزدکی بلوچ تحریک

اشوکا کے بہت عرصہ بعد بلوچستان ، کا کچھ علاقہ بیکٹر یائی سلطنت (آج کے وسطی ایشیا اور بلخ) کا نام نہاد حصہ بنا۔ نام نہادِ اس لیے کہ یہاں کوئی ٹِکا ہی نہیں۔ کانٹوں میں کیا ٹھکانہ !۔ لہٰذا، بہت دور بیٹھو اور بہت کھلی ڈلی حکمرانی کرو۔

اس سلطنت کا 130 ق م میں وسطی ایشیا کے ایک خانہ بدوش قبیلہ ساکا (Scythians) نے تختہ کر دیا۔ پہلی صدی ق م کے شروع میں ساکا جنوبی افغانستان اور بلوچستان سے آگے بڑھے۔ اور وہاں سے ہندوستان گئے اور 400 سال تک حکمرانی کی۔(1)

پانچویں صدی میں بلوچستان پہ ہندی اثرات کی بالادستی نظر آتی ہے ۔ جب ہند کے ملک شرماہ نے اپنی بیٹی ساسانی سلطنت کے حکمران بہرام گور (404 تا 427) سے بیاہ دی اور جہیز میں سندھ اور مکران دے دیے۔

ساسانی بادشاہت کے دوران زرتشتی مذہب ریاستی مذہب تھا۔ مگر شاہ پور اول کے دور میں اس وقت ایک نیا مذہبی رہنما اور تحریک نمودار ہوئے جب مانی نے خود کو یسوع مسیح کا سب سے بڑا اور آخری حواری جتایا۔ ہرمزداول کے بھائی بہرام اول نے جو ایک عیاش اور پست ہمت بادشاہ تھا، مانی کو بالآخر ملاّؤں کے رحم پر چھوڑ دیا۔ مجمع عام میں مانی اور ملاؤں کے سربراہ یعنی موبدان موبد کے درمیان ایک مباحثہ ہوا اور چونکہ نتیجے کا فیصلہ موبدان موبد کی رائے پر تھا لہٰذا ظاہر ہے کہ مانی کو شکست ہوئی جس کے بعد اس کو الحاد کے جرم میں سزا دی گئی اور قید خانے میں اس کو وہ وہ

عذاب دیے گئے کہ وہ جاں بحق ہوا۔ یہ واقعہ 276 کا ہے۔ ایک مشرقی روایت کی رُو سے اس کو سولی پر چڑھایا گیا یا زندہ کھال کھینچی گئی۔ اس کے بعد اسے ایک دروازے کے اوپر لٹکا دیا گیا جس کی وجہ سے اس کا نام ''دروازۂ مانی'' پڑ گیا۔(2)

اس کی تحریک اور مذہب کا نام ''مانویت'' پڑا۔ اس تحریک سے ہمارے اس خطے میں موجود غلام داری سماج میں زبردست بحران آیا۔ مانویت نے اس سماجی ڈھانچے کو غیر منصفانہ قرار دیا اور اس پر زبردست تنقید کی۔

باوجود اُن اذیتوں کے جو مانویوں کو ایران میں موبدوں کے ہاتھ سے پہنچیں، ان کا مذہب مٹ نہیں سکا اور کم وبیش مخفی طور پر زندہ رہا۔(3)

ایسے میں جب دوسرے علاقے بھی مفتوحات میں شامل ہوتے رہے تو اس غلام دارانہ سماج کے بالائی طبقے کو دولت تو ملی مگر، ان کے سماج کے اندر بڑھتے ہوئے بحران میں بھی شدت پیدا ہوتی گئی۔ کئی بغاوتیں ہوئیں مگر عوام کو کوئی بڑی کامیابی نہ مل سکی۔

مگر کچھ ہی عرصہ بعد یہیں پر مزدک کی قیادت میں ایک اور تحریک شروع ہوئی۔ مزدک ایک ابتدائی سوشلسٹ (Protosocialist) تھا۔ ایک ایسا مصلح اور مذہبی شخص جس نے ساسانی شہنشاہ قباد اول کے دور میں زبردست اثر ورسوخ پیدا کیا۔ اس نے مشترکہ ملکیت اور سماجی بہبود کے پروگرام شروع کیے۔ وہ اپنے فلسفے کو زرتشتی مذہب کی اصلاح کردہ اور پاک کردہ صورت سمجھتا تھا۔

مزدکیوں نے سماجی برائیوں کے خلاف کھلے عام جدوجہد کرنے کا اعلان کیا۔ مزدک کی نظر میں لالچ، خود غرضی اور حرص ہی ساری برائیوں کو پیدا کرتے ہیں۔ اسی حرص اور استحصال نے ''انسانیت کی برابری'' والے خدائی حکم وخواہش کو تباہ کر دیا تھا۔ مزدک نے خدا کی اس خواہش اور حکم کی دوبارہ بحالی کو اپنا مقصد حیات بنا دیا (4)۔ اس کا مطالبہ تھا کہ رئیسوں سے فاضل جائیداد چھین لی جائے۔

وہ خود بھی زرتشتی ملاّ یعنی معبد تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ نجی ملکیت کے طرف دار زرتشتی ملاّ اُسے کافر قرار دیتے تھے۔

مزدکیت کے مطابق انسان کو اپنے عمل میں دنیا کے اندر روشنی پھیلانے کی جدوجہد کرنی چاہیے اور یہ کام بہتر اخلاقی رویوں اور مثالی زندگی سے کیا جا سکتا ہے۔ نرم خو ہونا چاہیے، مہربان، اور مہمان نواز ہونا چاہیے۔ مزدک نے برادرانہ امدادِ باہمی کی حوصلہ افزائی اور حرص و ظلم کو کم کرنے کے لیے جائیداد کو اجتماعی ملکیت میں دینے کا تصور پیش کیا(5)۔ کمیونزم اور مزدکیت میں کوئی فرق نہیں۔ بس یہ فرق ہے کہ مزدکیت سائنسی کے بجائے آئیڈیلزم (عینیت پسندی) کی خصوصیت رکھتی ہے۔ اور کمیونزم سائنسی صورت میں ڈویلپ کرتا رہا ہے۔

مزدک نے مذہبی رسومات کی اہمیت بہت کم کی۔ اس نے نفس کشی پر بہت زور دیا۔ نفسانی خواہشات حرص کو جنم دیتی ہیں جو دوسروں کے استحصال تک لے جاتا ہے(6)۔ اُس نے ایک سے زیادہ شادیوں پر ممانعت کر دی۔ وہ زرتشتی ملاؤں کی مضبوط پوزیشن پر تنقید کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ملاؤں نے عوام کو محکوم بنا رکھا ہے اور اُن کی غربت بڑھا دی ہے۔ (اور یہ خیال کس قدر سچ نکلا!)۔

مزدکیوں کا یہ معاشرتی نظریہ پیدا ہوا کہ خدا نے روئے زمین پر زندگی کے وسائل پیدا کیے تاکہ سب یکساں طور پر ان سے متمتع ہوں اور کسی کو دوسرے کی نسبت زیادہ حصہ نہ ملے۔ لیکن لوگوں میں نابرابری زبردستی کے ذریعے سے پیدا کی گئی اور ہر شخص نے یہ کوشش کی کہ دوسرے کا حصہ چھین کر اپنی خواہشات کو پورا کرے۔ لیکن حقیقت میں کسی شخص کو دوسرے کے مقابلے پر مال اور اسباب اور عورتوں کا زیادہ حصہ لینے کا حق نہیں ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ امیروں سے دولت چھین کر غریبوں کو دی جائے اور اُس مساوات کو دوبارہ قائم کیا جائے جو ابتدا میں بنی نوع انسان میں تھی۔ مال و دولت کو اس طرح مشترک بنانا چاہیے جس طرح کہ پانی اور آگ اور چراگاہیں ہیں، ایسا کرنا ثواب ہے جس کا خدا نے حکم دیا ہے اور اس کا وہ نہایت عمدہ اجر دے گا، اور جب کسی قسم کی قیود باقی نہ رہیں تو لوگوں کی باہمی امداد خدا کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ ہوگی۔(7)

مزدک کے مطابق ابتدا میں گزر بسر کا کافی سامان مہیا کیا مگر طاقت ور لوگوں نے کمزوروں کو خوف زدہ اور گم راہ کیا، اُن پہ بالادستی حاصل کی اور عدم مساوات پیدا کی۔

اُس کے مطابق اس بدبختی کا علاج انصاف کی بحالی ہے۔ اور ضرورت سے زیادہ ذخیروں کا حق دار محض ذخیرہ کرنے والا نہیں بلکہ ہر شخص کو اُن تک رسائی کا حق ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ ساری دولت کو مشترک بنانا چاہتا تھا۔ (یہ مارکس سے پانچ سو برس قبل کی بات ہے۔ اس لیے ایک بات ذہن نشین ہونے کی ہے؛ وہ یہ کہ کمیونزم کا تصور مارکس، اینگلز اور لینن سے صدیوں پہلے موجود تھا)۔

ساسانی دورِ سلطنت میں عوام کا استحصال اور ظلم انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ غلام داری عروج پر تھی اور اُس سے نکلنے کے اسباب ابھی تک پک نہیں گئے تھے۔

فیوڈل اشرافیہ کے ستم ناقابلِ برداشت ہو چکے تھے۔ نتیجہ یہ کہ غریب کسانوں کی شہروں کی جانب زبردست مائیگریشن ہوئی۔ مگر شہروں میں بھی انہیں غلام ہی برتا جاتا تھا۔ اسی ظلم و جور کے ارتکاز نے اُس انقلاب کا لاوا اگل دیا جس کی قیادت مزدک نے کی۔

عوام کی حالت اس قدر خستہ تھی کہ مزدک کے کمیونزم نے پذیرائی تو پانی ہی تھی۔ جب کوانٹیٹی بڑھتی جاتی ہے تو اپنے عروج پہ جا کر کوالٹی میں بدل جاتی ہے۔ چنانچہ آناً فاناً مزدک ازم مقبول ہوا۔ ہزاروں لاکھوں لوگ مزدکیت کے پیروکار بن گئے۔ چند ماہ کے اندر اندر سلطنت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مزدکیت ہی مزدکیت تھی۔ اور پھر۔۔۔ مزدک کے پیروکاروں نے امرا کے محلات پر حملے کیے اور وہ ساری قیمتی چیزیں اٹھا لے گئے جن پر انھیں مساوی حق دار ہونے کا یقیں تھا۔

چونکہ زرتشتی ملاؤں اور وڈیروں کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی اور بادشاہ اُن کی اس طاقت کو کمزور کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے شاہ (قباد اول) نے اس نئے نظریے کی حمایت کی اور وہ مزدکی مذہب میں شامل ہو گیا۔ (بادشاہ ہمیشہ مقبول عوامی مذہب کو استعمال کرتا ہے)۔ اس نے مزدک کی تعلیمات کے مطابق معاشی سماجی اصلاحات کیں۔ اس سے وڈیرے اور زرتشتی ملا اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ردِ انقلاب میں قباد کو سال 496 کو عارضی طور پہ اپنے بھائی جماسپ کے حق میں معزول ہونا پڑا۔ طاقت کے توازن کی اس بگاڑ نے اُسے پھر سب کچھ سمجھا دیا۔ اس نے فوراً ہی

پینتر ابدل ڈالا اور تین سال بعد دوبارہ اپنا پرانا مذہب اختیار کرنے کا اعلان کیا۔ ملاّ خوش، وڈیرے خوش۔ چنانچہ وہ دوبارہ حکمران بنا۔ اب وہ سمجھ چکا تھا کہ مزدکیت ایک ایسا کمیونسٹ انقلاب ہے جو اُس کی بادشاہت کے خاتمے پر جا کر دم لے گا۔

چنانچہ اب کے اس نے مزدکیوں ہی کا قتلِ عام شروع کیا۔ اس قتلِ عام کی قیادت اُس کے شہزادے خسرو اول نے کی جسے پھر نوشیروان کا خطاب ملا۔

نوشیرواں کے حکم سے مزدک کو گرفتار کیا گیا۔ اور اُسے باغ کے وسط میں اسی مقصد کے لیے خصوصی طور پر تیار کردہ بلند مقام پر زمین میں زندہ گاڑ دیا گیا۔ اور بے شمار تیروں سے اُسے چھلنی کر دیا۔ زندہ گاڑ کر تیروں کی بارش کرنا اور اِس طرح موت دے دینا! کیا ترس، کیا انسانی بنیادی حقوق! ردِانقلاب اپنی فطرت میں درندہ ہوتا ہے۔ سپارٹیکس کی موت، یسوع کی موت، مصدق و آلندے کی موت، برونو کی موت۔۔۔ لوگو! بادشاہ، ملاّ، پیر اور سردار کی مخالفت میں اپنی امکانی دردناک موت کا منظر نامہ جیب میں رکھ کر چلو!

مزدک کی شہادت کا یہ واقعہ 528 کے اواخر یا 529 کے اوائل میں پیش آیا۔ مگر عالمِ انسان کے لیے غم کا مقام یہ ہے کہ اِس ''انقلاب کی ناکامی'' کے بعد، اصل انقلاب صدیوں بعد 1917ء میں کامیاب ہوا۔

مگر ظاہر ہے اتنے بڑے نظریے کو ایک ہی دن میں تو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یا اچھا نعم البدل نظریہ لانا پڑتا ہے، یا پھر اُن نظریہ والوں کے قتل و قتال کو دوام دینا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ضیاالحقی خصوصیات والا نوشیروان 531 میں خود بادشاہ بنا تو اس نے مزدکیوں کے قتلِ عام کا ایک اور دور چلایا۔ کہتے ہیں کہ اس چنگیز کے ہاتھوں تیس ہزار مزدکی مارے گئے۔ (پتہ نہیں پھر بھی کیوں نہ تو مزدکی ختم ہوتے ہیں اور نہ ہی نوشیرواں والے۔ میوند سے ماوند تک، اور ملالہ سے محمد مراد تک صدیوں کا پندھ ہے، مگر جاری ہے، مگر ساری ہے!)۔

نوشیرواں نے بہ ظاہر تو مزدک کی تعلیمات کو مکمل طور پر تباہ کر دیا مگر یہ فلسفہ تو مزدک کی شہادت سے بعد بھی صدیوں تک جاری رہا۔ بلاشبہ مزدک کی انقلابی تحریک ہمارے خطے کی تاریخ

میں سب سے بڑی طبقاتی تحریک تھی۔(8)

اور یہ زمانہ اسلام سے پہلے کا تھا۔ اُس زمانے کے بلوچوں کی اکثریت اسی انقلابی مذہب ''مزدکیت'' سے وابستہ تھی۔ مزدکیت فوراً ختم نہ کی جا سکی اور بالخصوص دارالحکومت سے باہر دور دراز کے علاقوں میں تو یہ کسی نہ کسی شکل میں کئی صدیوں تک قائم رہی۔ (اور یہ معاملات جینز میں موجود ہی رہتے ہیں)۔

******

نوشیروان (خسرو پرویز) نے محض اُس کمیونسٹ تحریک کو کچلنے اور اپنے اصلی استحصالی نظام کو بحال کرنے کے نام پر ہی بلوچوں کے قتلِ عام پہ بس نہ کیا۔ اس نے تو جب دریائے سندھ تک پیش قدمی کی (531 عیسوی میں) تو بھی پورے راستے میں بلوچوں کو تباہ و برباد کرتا چلا گیا۔ اس کی ظلم و جبر کی سلطنت میں موجودہ افغانستان، بلوچستان، موجودہ ایران، عراق اور کچھ عرب علاقے شامل تھے۔ اس کے ظلم و جور کی ضرب المثل آفریدیوں کے پشتو میں یوں ہے:

چه نوشیروان بادشاه وی
اختك و بختك وزیران وی
نوں ڈیرے بوڑے کنڈ والے به وگورے

ترجمہ:

اگر نوشیروان بادشاہ ہو
اختک بخ تک اُس کے وزیر ہوں
تو بے شمار آباد گھروں کو کھنڈروں میں بدلتے دیکھو گے

بلوچ خانہ بدوش مویشی بان تھے، کاشتکار تھے۔ اُن کی معاشی ضرورتیں انھیں بارشوں سے سرسبز شدہ چراگاہوں اور میٹھے پانی بھرے گڑھوں تالابوں کی طرف کھینچ لاتی تھیں۔ بلوچوں نے علیم والوں سے دوستی گانٹھ کر شمال میں بحیرہ خضر کے جنوبی اور مغربی علاقہ گیلان والوں کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ کرمان سے لے کر مازندران تک سارے بلوچوں نے بغاوت کا علم بلند کیا۔

نوشیروان کی فوجوں نے بلوچوں کی آبادیوں پر قیامت خیز حملہ کر دیا۔ اس کی خون ریز اور سفا کانہ کاروائی میں بلوچ لڑتے گئے، کٹتے گئے ۔ پوری آبادی تو نہیں، مگر لڑائی میں شامل لوگ ''کوہِ البرز'' سے نکلے اور دو حصوں میں منقسم ہو کر مکران میں زابل سیستان پہنچے۔ خسرو اول جو کہ ہرمزین نوشیروان کا بیٹا تھا، کہتے ہیں کہ ایک سال تک مکران میں قیام پذیر رہا۔ جب خسرو مکران سے چلا گیا تو اس نے اشکاش کو اس علاقے کا گورنر بنا دیا۔

بلوچوں کے خلاف نوشیرواں کے اس حملے کا بیان، ''شاہنامہ'' میں دیا گیا ہے۔ اِس بے عدل اور ظالم بادشاہ کے بارے بہت غلط تعریفیں پھیلائی گئی ہیں۔ اُسے نوشیروانِ عادل کہا جانے لگا اور اُس کی منصفی کے قصے گھڑے گئے ۔ آیئے اِن سارے باطل تاثرات کو زائل کرنے کے لیے ''شاہنامہ'' کا یہ ٹکڑا نقل کرتے ہیں:

همی رفت و آگاهے آمد به شاه
که گشت از بلوچی جهانے تباه
زبس غارت و کشتن و تاختن
ز نفرین پراگشده گشت آفرین
دلِ شاه نوشیرواں شد غمی
برآمیخت اندوه باخرمی
به ایرانیاں گفت ، الانان و هند
شد از بیم شمشیر ماچوں پرند
بشنده نباشیم باشهر خویش
همے شیر جوئیم و پیچاں زمیش
بدوگفت گوئنده کائے شهر یار
بپالیز گل نیست بے رنج خار
هما رزتا بود بارنج بود

زبهر پراگندن گنج بود
زکار بلوچ، ارجمند اردشیر
بکوشید، باکاردانان پیر
نبد سود مندی به افسون و رنگ
نه از بند و رنج و نه پیکار و جنگ

زگفتار دهقان آشفته شاه
بسوئے بلوچ اندر آمد ز راه
چو آمد به نزديك آں برزه كوه
بگردید گرد اندرش باگروه
بدان کوه گرد اندر آمد سپاه
که بستند برمار و برمور راه
همه دامن کوه تا روئے شخ
سپاه بود برسان مور و ملخ
منادی گرے گرد لشکر بگشت
خروش آمد از کوه و از غار و دشت
که هر گز بلوچی بیابند خورد
چه از تیغ داران مردان گرد
وگر انجمن باشد از اندکے
نباید که یابد رهائی یکے
چو آگاه شد لشکر از خشمِ شاه
سوار و پیاده به بستند راه

از ایشان فراوان و اندك نماند
زن و مرد جنگی و کودك نماند
سراسر بشمشیر بگذاشتند
ستم کردن کوچ برداشتند
بشد ایمن از رنج ایشان جهان
بلوچی نماند آشکار و نهان
چنان بد که بر کوه ایشان گله
بدی بی نگهبان و گردی یله
شبانی نه بودی بر گوسفند
به هامون و بر تیغ کوه بلند
همه رنجها خوار بگذاشتند
در و کوه راخانه پنداشتند

ترجمہ:

وہ (انوشیروان) اپنی راہ چلا، اور مخبر اس کی طرف آئے:
''دنیا کو بلوچوں نے تاراج کر دیا ہے
حد سے بڑھتے ہوئے قتل سے تاخت و تاراج کرنے سے
اور تباہی سے زمین برباد ہو چکی ہے
دلِ نوشیرواں بادشاہ کا، غمگین ہوا
اور غم خوشی کے ساتھ گڈمڈ ہو گیا
اس نے ایرانیوں سے کہا: ''الانان اور ہند
ہماری تلوار کے خوف سے پرندے کی طرح کپکپاتے تھے

اب ہماری اپنی رعایا ہمارے خلاف ہو گئی ہے
کیا ہم شیر شکار کریں اور بھیڑ سے ہاتھ دھو بیٹھیں؟''
ایک نے اُس سے کہا کہ اے شہریار!
باغ میں کوئی گلاب بغیر کانٹوں کے نہیں ہے
اے شاہ! یہ حملہ کرنے کی مہمات
حد سے زیادہ تکلیف دہ ہیں
اور خزانہ ضائع کرنے والے بھی
بلوچ پہ عظیم الشان اردشیر نے کوشش کی
ساتھ اپنے سارے تجربہ کار افسروں کے
مگر اس کی ساری حکمت عملیاں چالاکیاں
اس کے جھوٹ اس کی محنتیں، ہتھیار، اور لڑائی کام نہ آئیں

دہقان سے ناکامی کی کہانی نے شاہ کو غضب ناک کر دیا
وہ بلوچ کی طرف گیا
جب وہ اُن بلند پہاڑوں کے قریب پہنچا
وہ اُن کے گرد اپنے گروہ کے ساتھ گیا
اور اس کے میزبان نے اُن کے گرد گھیرا ڈالا
پہاڑوں سے، غاروں اور میدانوں سے اُمڈتے ہوئے
''جب بھی بلوچ خوراک کی تلاش کریں
اگر وہ جنگ باز ہیں، اسلحہ اٹھائے ہوئے ہیں
خواہ بہت ہوں یا کم

اُن میں سے ایک بھی بچ کر نہ جائے‘‘
فوجی دستے، شاہ کے غصے سے واقف
اپنے گھوڑوں اور پیادوں نے باہر نکلنے کی ہر راہ کو روک دیا
چند ہی بلوچ بچ گئے یا کوئی بھی نہ بچا
کوئی عورت، بچے، جنگ باز نہ بچے
سب تلوار سے ختم ہوئے
اور ان کی ساری بدی ختم ہوئی
دنیا اُن کی غارت گری سے سکون میں آئی
کوئی دیکھا اور اَن دیکھا بلوچ نہ بچا
اس قدر کہ اُن پہاڑوں پر
ریوڑ بغیر محافظ کے رہے
بنجر میدان اور پہاڑ کی چوٹی پر یکساں
لوگوں کو ماضی کی مصیبتیں فراموش ہوگئیں
دروں اور پہاڑوں کو اس طرح دیکھنے لگے جیسے یہ اُن کے گھر ہوں!

بعدازاں بلوچستان، بالخصوص اس کا مغربی علاقہ اگلی دوصدیوں تک انھی ساسانیوں کے ساتھ بہت ڈھیلی صورت میں نتھی رہا۔ خسرو پرویز(591ءتا628ء) نے اپنے باپ کی سلطنت کے (سندھ کی جانب) مشرقی علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرلیا، جنھوں نے بغاوت کی تھی۔ بعد میں کمزور شدہ ساسانیوں کو سندھ کے برہمن حکمرانوں نے زیر کرلیا جن کی حکومت بلوچستان تک پھیلی ہوئی تھی۔

ریفرنسز

1- دشتی، جان محمد Essay on Baloch National Struggle in Pakistan۔ گوشۂ ادب، جناح روڈ کوئٹہ، صفحہ 7

2۔ کرسٹن سین آرتھر / محمد اقبال۔ ’’ایران بعہدِ ساسانیانِ۔‘‘ انجمن ترقی اردو۔ 1941ء۔ صفحہ 258

3۔ ایضاً۔ صفحہ 262

4 - براؤن، ایڈورڈ، جی۔ ’’ اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا‘‘ جلد نمبر ا۔ کیمبرج، 1929ء۔ صفحہ 170۔

5۔Corne, Patricia ۔Kawad's Heresy ۔" Mazdak Revolt in Iran" (1991), P- 21-40

6۔Yarshater, Ehsan. The cambridge history of Iran , vol-2 P-999

7۔ کرسٹن سین آرتھر اقبال۔ ’’ایران۔۔۔‘‘ صفحہ 456

8- ایچ جی ویلز۔ ’’مختصر تاریخ عالم‘‘۔ 2001ء۔ تخلیقات لاہور۔ صفحہ نمبر 175

چچ اور چچ نامہ

بلوچ اور بلوچستان کے بارے میں ہمیں کچھ معلومات اسی عنوان کے تحت ملتی ہیں۔ ایک عوام کی تاریخ معلوم کرنے کے لیے کن کن ذرائع سے گل چینی کرنی پڑتی ہے!!

635ء تک رائے خاندان کے حکمرانوں نے ہمارے پڑوس میں برہمن حکمران کو زیر کرلیا تھا' جو کہ پانچ پشتوں سے حکمرانی کر رہا تھا۔ اُن کی سلطنت ملتان سے لے کر ساحلِ سمندر، اور ساحل سے لے کر پہاڑوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ جس میں بلوچستان کا علاقہ جھالاوان بھی شامل تھا۔

اِس رائے حکمرانوں سے کیا لینا دینا، بس یہ ذکر ضروری ہے کہ ان کا آخری بادشاہ رائے ساھاسی تھا۔ وہ جب مرا تو چچ نامی اس کے برہمن وزیر نے بیوہ ملکہ (رانی سوہنی دیوی) سے شادی رچالی اور تخت پر بیٹھ گیا۔ مسکراہٹ کی بات ہے کہ برہمن کا بیوہ سے شادی کرنا برہمنی تعلیمات کی یکسر خلاف ورزی تھی۔ لیکن حکمران تو مذہب اپناتے نہیں استعمال کرتے ہیں۔ اُس نے منڈی میں ہمہ وقت برائے فروخت موجود برہمن مولویوں سے اپنے حق میں فتوے حاصل کیے اور اس شادی کو جائز قرار دلایا۔ رانی سوہنی کی پہلے کوئی اولاد نہ تھی۔ اب اس شادی کے بعد چچ سے اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی۔ ان کے نام علی الترتیب یہ تھے: داہر، دہر سینہ اور بائی مابین۔(1)

اِدھر 632ء میں فارس پر ملکہ توران دُخت کی حکومت تھی جو کہ خسرو پرویز (شیریں فرہاد والے خسرو) کی بیٹی تھی۔ اس نے کرمان اور مکران پر یلغار کی تھی۔ واضح رہے کہ خسرو پرویز کو جب اس کے بیٹے شیرویہ نے (جو شیریں کے بطن سے تھا) قتل کر دیا تھا تو اس قتل کے تین چار سال بعد

توران دُخت تخت نشین ہوئی تھی۔ اسی ملکہ کے زمانے میں قبضہ گر چچ ایک دن شبھ گھڑی نکلوا کر ارمن بیلہ (موجودہ ضلع لسبیلہ میں سامونڈی کے قریب ایک شہر) کی سمت روانہ ہوا۔ یہاں کا راجہ بودھ شرامن تھا جو کہ رائے ساہسی کے مقرر کردہ حاکموں کے خاندان سے تھا۔ مگر بعد میں یہ لوگ رائے خاندان کے مخالف ہوئے۔ اس بودھ راجے نے آگے بڑھ کر رائے چچ کا استقبال کیا اور اس کے ساتھ دوستی کا عہد کیا۔ اس کے بعد چچ، کرمان کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ مکران سے آگے گیا تو وہ بکر کے علاقے میں آ گیا۔ اس شہر میں ایک قدیم قلعہ تھا۔ جس کا نام تب ''پنج پور'' تھا اور یہ اُس جگہ تھا جہاں اب پنجگور ہے۔ یعنی ڈیڑھ ہزار سال قبل تک پنجگور، پنجپور تھا۔ چچ نے بعد میں پنجگور بنے اس پنجپور کے قلعے پر قبضہ کرلیا۔ پھر وہ اس جگہ گیا جہاں کرمان اور مکران کے درمیان ایک دریا ہے۔ اس کے کنارے ایک جگہ کھجور کے جھنڈ تھے۔ وہاں پر اُس نے لکھوایا:

''یہ جگہ ہند کی سرحد تھی چچ کے وقت میں، جو بیٹا تھا سیلاج کا، جو بیٹا تھا باسا باس کا۔ یہ سرحد آج ہمارے قبضہ میں آئی ہے''۔(2)

چچ نامہ میں ہے کہ اس کے بعد وہ واپس توران کے علاقے کی طرف روانہ ہوا۔ اور گنداواہ پر حملہ کرنے وہاں پہنچا۔ (گنداواہ کی بنیاد پارس کے بادشاہ بہمن نے رکھی تھی)۔ چچ' گنداواہ کے باہر میدان میں خیمہ زن ہوا اور شہر پر حملے کی تیاریاں کیں۔ گنداواہ کی فوجیں قلعہ بند ہوگئیں۔ کچھ عرصہ محاصرے کے بعد گنداواہ شہر کے لوگ صلح کے طلب گار ہوئے۔ دونوں کے بیچ ایک معاہدہ ہوا جس کے مطابق ان پر سالانہ خراج 100 پہاڑی خچر اور ایک لاکھ درہم مقرر ہوئے۔ ایک سال کا ٹیکس پیشگی وصول کیا گیا جس کی وصولی کے بعد وہ واپس اروڑ گیا اور چالیس سال تک حکومت کرنے کے بعد 671ء میں مرگیا۔(3)

یعنی، چچ' ارمابیل (لسبیلہ) سے مارچ کرتا ہوا جہلاوان کے علاقے سے کندابیل (گنداواہ) تک، اور اس کے بعد سبی تک دریائے ناڑی (بیجی) تک آیا۔

چنانچہ بلوچستان کا ایک حصہ بالخصوص مکران' عربوں کے حملے شروع ہونے تک چچ کے تحت رہا۔

ریفرنسز

1۔ یحییٰ امجد۔ ''وسطی عہد''۔ صفحہ 40
2۔ قلیچ بیگ۔ ''چچ نامہ''۔ صفحہ 68
3۔ یحییٰ امجد۔ ''وسطی عہد''۔ صفحہ 40

عرب تحریریں

بلوچ کلاسیکل شاعری میں بتایا گیا ہے کہ:

ماھواں رندوں ژہ حلبا پاذ آتکغوں
دو برا جنگی گوں یزیدیاں ماناتکغوں

(یعنی بلوچ وہ رند ہیں جو حلب سے نکلے۔ دوبار یزیدی فوج سے ٹکرا گئے)

یہ نظریہ بلوچوں میں بہت طاقت ور انداز میں موجود ہے۔ یہ دو مصرعے ہر بلوچ گھرانے کے روزمرہ گھریلو استعمال کے مصرعے ہیں۔ ان اشعار کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ بلوچوں کی عرب (حلب) سے بلوچستان آمد حضرت امام حسینؓ اور یزید کی جنگ کے بعد ہوئی ہو گی۔ اور وہ اُس کے بعد وہاں سے بلوچستان آئے۔ حالاں کہ اس شعر میں بیان کردہ زمانے سے بہت پہلے عرب، بلوچستان پہنچ چکے تھے۔

دیکھیے ناں، ساتویں صدی کے پہلے نصف کے دوران مدینہ میں اسلام آ گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے جلد ہی اپنی سرحدیں بڑھانی شروع کی تھیں۔ مگر وہاں، فوج تنخواہ وغیرہ پہ کام نہیں کرتی تھی۔ نہ انہیں معاوضہ زمین کی صورت میں دیا جاتا تھا۔ عرب فوج کو جنگ میں حاصل شدہ مالِ غنیمت میں سے حصہ کے بطور معاوضہ ملتا تھا۔ اس رواج کی وجہ سے نسبتاً طویل عرصے تک فوج کے لڑنے کی صلاحیت باقی رہی۔

زمین کا بیشتر حصہ یا تو نجی ملکیت میں تھا یا پھر قبیلہ کی ملکیت میں۔ جوں جوں رقبہ بڑھتا گیا ریاست کی زمینوں کے ٹکڑے ملٹری اور سول بیوروکریسی کو ملنے شروع ہو گئے۔ مگر یہ زمینیں انھیں مدت ملازمت تک کے لیے دی جاتی تھیں۔ اس طرح زمیں داروں اور طاقت ور امرا کے ایک نئے طبقے کی تشکیل کا آغاز ہوا جن کی جائیداد ریاست کی ملازمت پر منحصر ہوتی تھی۔ یہ زمین مالکوں سے اُس وقت واپس لی جاسکتی تھی جب نیا مالک مطلوبہ فرائض انجام دینا شروع کر دیتا۔ آپ اندازہ کریں کہ پیغمبرِ اسلامؐ کے وصال کے بیس برس کے اندر اندر عربوں نے مشرقِ وسطیٰ کا پورا علاقہ فتح کر لیا تھا۔ اور سو سال بعد تو اٹلانٹک سے لے کر بحر ہند تک کا سارا علاقہ اُن کے تصرف میں تھا۔

اس دوران بہت ساری مہموں کے دوران خانہ بدوش لوگ پیشہ ور فوجی بن گئے اور بعد میں مختلف مفتوح ممالک میں زمیندار بن گئے۔ اس سے جاگیردارانہ سماجی طرز کو تقویت حاصل ہوئی اور حکومت کو قابلِ اعتماد فوجیں بھی مہیا ہو گئیں۔ ان فوجوں کی گزر بسر مفتوحہ ممالک سے ہوتی تھی۔ جو شخص اُن کے سامنے مزاحمت کے بغیر ہتھیار ڈال دیتا وہ اُن کی جائیداد کو ہاتھ نہ لگاتے تھے۔ اس سے مفتوحہ علاقوں میں آبادی کے خاصے بڑے حلقے نیوٹرل ہو گئے۔ وہاں سے فوجی بھی بھرتی نہیں کیے گئے اور مقامی امرا کو مراعات سے بھی محروم نہ کیا گیا۔ وہ صرف محصول اکٹھا کرنے پر اکتفا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں مفتوحہ علاقوں کو ریاستی ملکیت قرار دے کر گو کہ مقامی آبادی پر محصول عائد کیے گئے مگر مقامی سرداروں پر محصول کا بوجھ بہت حد تک گھٹا دیا گیا تھا۔

المختصر یہ حکمرانی ایک جامع معاشی نظام رکھتی تھی۔ سروس کے عوض مشروط زمینداری، لازمی محصولات اور فوجی خدمت...... دشمنوں کی زمینیں جب عام پیمانے پر از سر نو تقسیم کی گئیں تو زمین کی اس وضع کی ملکیت کا غلبہ ہو گیا۔ طاقت ور سرداروں کی زمین پر عام طور پہ پابند کسان کام کرتے تھے۔

خلیفہ ثانی، حضرت عمرؓ کے وقت پہلی بار ایک جماعت مکران بھیجی گئی تا کہ اُس علاقے کے حالات و کوائف کا جائزہ لیا جاسکے۔ اُس جماعت نے مکران کے بعض علاقوں کو دیکھا اور واپس جا کر خلیفہ کو یہ رپورٹ پیش کی: ’’اس علاقے کی خیر سے اس کا شر زیادہ ہے۔ پہاڑ تو پہاڑ اس کے

میدان بھی پہاڑوں سے زیادہ دشوار گزار ہیں‘‘۔ جماعت کے سربراہ نے کہا کہ ’’اس علاقے میں تھوڑی فوج رکھنے سے اُس کے مغلوب ہونے کا خطرہ ہے۔ اور زیادہ فوج کے لیے وہاں غلہ اور پانی نہیں ہے، اور وہ بھوک اور پیاس سے ختم ہو جائے گی‘‘۔ یوں، بلوچستان پر حملہ کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا گیا۔ مگر حضرت عمرؓ ہی کی خلافت (634-643) کے آخری برس عبداللہ بن عبداللہ کی فوج یہاں آئی۔ مکران کے سعد نامی حکمران نے زبردست مزاحمت کی، مگر شکست کھا گیا۔

حضرت عثمانؓ کے عہدِ حکومت (644-656) میں عبدالرحمٰن بن ثمرہ نے سیستان کے پایہ تخت زرنج سے لے کر کیچ مکران تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ اس فتح میں بلوچستان کے ’’بختی‘‘ اونٹ اور بھیڑ بکریاں ملیں (1)۔ ہمیں عرب لٹریچر سے اندازہ ہوا کہ بلوچستان میں اُس زمانے میں ’’بختی‘‘ اونٹ پائے جاتے تھے۔

23ھ میں مکران کی فتح پر الحکم بن عمرو ثغلبی نے درج ذیل اشعار کہے:

لقد شيخ الارامل غير فخر
بغئى جاء من مكران
اتاهم بعدمشقته وجهد
وقد صفر الشاتمن الدخان

ترجمہ:

اس میں فخر کی بات نہیں
کہ مکران کے مالِ غنیمت سے بیوائیں سیر ہو گئیں
یہ مالِ غنیمت مُشقت اور جدوجہد سے حاصل ہوا
گھر میں چولہا نہ جلنے کی وجہ سے موسم سرما دھوئیں سے خالی تھا (2)

پھر، حضرت علیؓ (عہد حکومت: 661-655) نے 658ء شاغر بن داعو کی قیادت میں ایک لشکر بھیجا۔ اس نے کوہ قیقانان (قلات) تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ جب وہ فوج کوہ قیقانان میں پہنچی تو 20 ہزار بلوچ پہاڑی دروں کی حفاظت کے لیے ڈٹے ہوئے تھے۔ مگر، تاریخ نے اپنے فیصلوں پر عمل کروانا ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ بلوچ شکست کھا گئے اور قلات فتح کر لیا گیا۔ اس جنگ میں

بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ لگا اور ہزاروں نوجوان مرد اور عورتیں غلام اور کنیزیں بنائی گئیں۔

رفتہ رفتہ عرب حکمرانی میں ایسے نئے ملکوں کو شامل کیا گیا جو معاشی اعتبار سے اُس کے دستِ نگر نہیں تھے اور جہاں مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے جن کی اپنی الگ تاریخ اور روایات تھیں۔ ان کی وجہ سے ریاست میں بالکل ویسی بدامنی پیدا ہوئی جو جاگیرداری نظام والی تمام ریاستوں میں ہوا کرتی تھی۔

یہاں ایک دلچسپ بات ہوئی۔ سواروں پر مشتمل فوجوں نے (جنھیں صرف ''مالِ غنیمت'' میں حصے کا حقدار تسلیم کیا گیا تھا) حضرت علیؓ کی قیادت میں اُن رئیسوں کے خلاف بغاوت کردی جنھوں نے بڑی بڑی زمینیں حاصل کی تھیں۔ 656ء میں حضرت علیؓ خلیفہ بن گئے مگر رئیس طبقہ نے اپنی طاقت اکٹھی کرلی اور بنی امیہ کے امیر معاویہ کی قیادت میں تحریک چلائی۔

اس تحریک کا گڑھ شام تھا جو کہ نئے مفتوحہ ملکوں میں سے زیادہ منظّم ملک تھا۔ طاقت ور سرداروں کی پشت پناہی میں امیر معاویہ نے شام سے آدمی اور سامان کی کمک حاصل کرکے ان لڑائیوں میں فتح حاصل کرلی۔ حضرت علیؓ شہید کردیے جاتے ہیں اور حکمرانی پر امیر معاویہ قابض ہوجاتا ہے۔ امیر معاویہ نے شام کو بدستور اپنا ہیڈ کوارٹر بنائے رکھا۔

امیر معاویہ نے عبداللہ عبدی کو چار ہزار سواروں کے ساتھ ہمارے خطے پر قبضہ کرنے بھیجا مگر چچ نامے کا مصنف راجہ چچ (راجہ داہر کا باپ) اپنے چچ نامہ (صفحہ 103) میں ذکر کرتا ہے کہ 41 ہجری میں خضدار اور گنداواہ کے کوہستانوں میں اُسے شکست دی گئی۔ پھر اس نے تین چار سال بعد راشد بن عمرو کی قیادت میں دوسرا لشکر بھیجا۔ اس سے بھی بلوچستان دو دو ہاتھ کرگیا اور راشد مارا گیا۔ اموی لشکر کو واپس جانا پڑا پھر سنسان بن سلمہ آیا، قتل ہوا۔ (3)

664ء میں امیر معاویہ کی خلافت میں المنظر خضدار پہ حاوی تھا۔ وہ وہیں مرگیا۔

اُدھر عربستان میں داخلی چپقلش زوروں سے جاری تھی۔ جب عبدالما لک (684-705) حکمران بنا تو اس نے حجاج کو عراق کا گورنر بنایا۔

حجاج بن یوسف 694ء میں عراق کا والی بنا تو اس نے سعید بن اسلم کلابی کو مکران پر

حکومت کرنے بھیجا۔ جب سعید مکران پہنچا تو وہاں ایک مسلمان سردار سفہوی بن لام سے اس کی تلخ کلامی ہوگئی اور اس نے سفہوی کو قتل کردیا۔ سعید بن اسلم قلابی نے مکران اور اردگرد کے علاقوں سے پہلے کی نسبت بہت زیادہ ٹیکس وصول کرنے شروع کردیے۔ عرب آباد کار علافی خاندان اس زمانے میں مکران کی سرحد پر آباد تھا اور راجہ داہر کا حلیف تھا۔ سفہوی ان کا رشتہ دار تھا۔ علافی قبیلے نے حملہ کر کے سعید کو قتل کردیا اور خود مکران پر قبضہ کرلیا۔ (4)

حجاج بن یوسف نے کچھ عرصہ بعد مجاعہ بن سعر تمیمی کو گورنر مکران بنا کر بھیجا۔ تب تک علافی مکران سے واپس چلے گئے اور سندھ میں راجہ داہر کے تعاون سے اس علاقے میں آباد ہوگئے تھے۔

واضح رہے کہ سعید کے بعد موجا کو مکران کا انچارج بنایا گیا تھا۔ مگر وہ 705ء میں مرگیا اور محمد بن ہارون نے اس کی جگہ لے لی۔ اس نے بودائیل کی قیادت میں اس فوج کی مدد کی جو سیلون کے حکمران کی طرف سے خلیفہ کو بھیجے گئے آٹھ جہازوں پہ لدا ہوا سامان قزاق، کرک اور میدوں سے واپس لینے آیا تھا۔ مگر یہ مہم ناکام ہوئی اور بودائیل قتل ہوا۔ حجاج نے اس پورے خطے کو فتح کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اس نے خلیفہ ولید سے سندھ پر حملہ کرنے کی اجازت مانگی تو خلیفہ ولید بن عبدالملک (705-715) نے اخراجات کا عذر کیا۔ اس پر حجاج نے لکھا کہ جنگ میں جو خرچ ہوگا اس کا دگنا تگنا واپس کرنا میری ذمہ داری ہے۔ حجاج نے یہ عہد پورا کیا۔

حجاج نے محمد بن قاسم اموی کو سپریم کمانڈر بنا کر بھیج دیا۔ محمد ہارون اس کے ساتھ ہوا مگر وہ مرگیا، اور بیلہ میں دفن ہوا۔ محمد بن قاسم اموی نے ایک ماہ مکران میں ٹھہرنے کے بعد پہلے پنجگور کو، اور پھر ارمن بیلہ کو فتح کر کے چند ماہ وہاں قیام کیا۔ (5) ارمن بیلہ سے وہ سیدھا بھنبور (دیبل) روانہ ہوا۔ اُس وقت داہر کا بیٹا جے سنگھ نیرون یعنی حیدرآباد میں تھا۔ محمد بن قاسم نے چچ کے بیٹے داہر سے سندھ فتح کیا اور مکران کو اس میں شامل کردیا۔ اس نے جب دیبل فتح کرلیا تو بلا امتیاز سارے سپاہیوں کو مارڈالا اور سب سے بڑے مندر پر قبضہ کرکے سارے مذہبی راہنماؤں کو قتل کردیا۔ مندر سے تقریباً 700 عورتیں قبضہ میں لے کر انھیں لونڈیوں کی حیثیت سے فروخت کردیا گیا۔ دیبل سے حاصل کردہ مال فوج میں مقام اور رینک کے مطابق بانٹ دیا گیا۔ خلیفہ کا پانچواں

حصہ اُسے روانہ کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ اس منطقے کو فتح کرنے پر چھ کروڑ درہم خرچ ہوئے۔ اس کے عوض حجاج نے بارہ کروڑ درہم شاہی خزانے میں جمع کیے۔ یہ نقدی اس رقم کے علاوہ تھی جو لشکریوں میں تقسیم ہوئی۔(6) دیبل کی فتح، سپاہیوں کے قتلِ عام اور شہر و مضافات کی لوٹ نے عوام سے مزاحمت کی ہر نشانی مٹا ڈالی اور محمد بن قاسم کے لیے دیگر شہروں اور علاقوں کو فتح کرنا آسان ہو گیا۔ اس لیے نیرون کوٹ، سیوستان، برہمن آباد، آرور، اور ملتان ایک ایک کر کے ہتھیار ڈالتے رہے۔

محمد بن قاسم اموی ابھی ملتان میں بیٹھا ہندوستان پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ حجاج بن یوسف 715ء میں مر گیا۔ اور چند ماہ بعد حجاج کا مربی خلیفہ ولید بن عبدالملک بھی اس دنیا سے چل بسا۔

ولید کے بعد اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک (715-717) جو حجاج کا جانی دشمن تھا، خلیفہ بن گیا۔ اس نے حجاج کے قرابت داروں سے چن چن کر بدلہ لیا۔ اس دشمنی کا خمیازہ محمد بن قاسم کو بھی بھگتنا پڑا۔ اور خلیفہ سلمان کے جلاد گرفتاری کا پروانہ لے کر پہنچے اور محمد بن قاسم کو کھال میں لپیٹ کر عراق روانہ ہو گئے۔ وہ 21 سال کی عمر میں راستے ہی میں مر گیا۔

یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ سیوستان وہ شہر ہے جسے اب سہون کہتے ہیں۔ صوبہ سیوستان میں بودھیہ، جنکان اور روجھان کی پہاڑیوں کے مضافات سے لے کر مکران تک کے تمام علاقے شامل تھے۔ سیوستان کا علاقہ سبی سے لے کر ساحل مکران تک پھیلا ہوا تھا۔ بودھیہ موجودہ ضلع لاڑکانہ کا پورا علاقہ اور ضلع جیکب آباد کا مغربی علاقہ تھا۔ اور اسے یہ نام اس لیے دیا گیا کیوں کہ یہاں کی آبادی کا مذہب بدھ مت تھا۔

عرب فاتحین بلوچستان کو آناً فاناً مسلمان نہ کر سکے بلکہ بلوچ بہت عرصے تک اپنے عقیدوں پر قائم رہے۔ کہیں جا کر دسویں صدی کے مؤرخوں نے بلوچوں کا ذکر مسلمانوں کی حیثیت سے کیا ہے۔

جب عرب فاتح بن کر اس خطے میں آئے تو اُس وقت رائے سلطنت، قندھار تک اپنی رعایا سے خراج وصول کرتی تھی۔ عربوں نے دوسرے ٹیکسوں کے علاوہ خراج (زمین کا ٹیکس) بھی وصول

کرنا شروع کیا۔ مقامی قبیلے کا سربراہ اس کے لیے یہ کام کرتا تھا۔ اسے وہ ''ارباب'' کہتے تھے۔(7) ہم فاتحین کی تاریخ بالکل لکھنا نہیں چاہتے۔ ہم تو بلوچستان کی عوامی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ فاتحین کا تذکرہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ یورپی حملہ آوروں کو چھوڑ کر باقیوں کی اپنی تاریخ غلط لکھی گئی۔ ہمارے برصغیر میں اموی، عباسی، ترکمن وغیرہ کو حملہ آور کے بطور نہیں لکھا گیا۔ اُن کو مسلمان لکھ کر ایک طرح سے اُن کی حمایت کی گئی۔ بہت دفعہ تو ایسا ہوا کہ انھیں جارح کے بجائے نجات دہندہ کے بطور پیش کیا گیا۔ حملہ آوروں اور فاتحین کا تذکرہ اس مجبوری سے بھی کیا جا رہا ہے کہ اُس زمانے کے ہمارے عوام کے بارے میں کچھ معلومات اُن کی تحریروں اور شاعری سے ملتی ہیں۔

بہر حال، عرب جب وسطی بلوچستان میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ خضدار اور گنداواہ کے درمیان کا علاقہ ترکوں کے پاس تھا اور کیکان (نال) اس علاقے کا اہم مقام تھا۔ نال کے قریب عربوں کی بستی ''البیضہ'' کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ قصدر (خضدار)، کیکان، قندابیل اور مستنج (مستنگ) اس دور میں اہم تجارتی مرکز تھے۔

اموی خاندان کے دور حکومت (750-661) میں عربوں اور مقامی حکمران کے درمیان تعلقات میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ بعد میں اموی خلفا نے محصولوں میں بڑے پیمانے پر اضافے کیے۔ وسیع سلطنت کو چلانے کے لیے جو فوجی بجٹ درکار تھا، وہ بڑے بڑے محکم علاقوں کے استحصال سے بھی پورا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ امویوں کی وسیع سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا۔ فوج مختلف درجوں والے زمینداروں کے طبقے میں بدل گئی۔ آٹھویں صدی کے پہلے نصف میں مفتوحہ علاقوں کے اندر سلسلے وار بغاوتیں ہوئیں۔ یہ بغاوتیں بالآخر خود شام تک پہنچ گئیں۔ وسطی ایشیا میں زبردست بغاوت ہوئی جو بعد میں عراق اور ایران تک پھیل گئی اور امویوں کے زوال کا باعث ہوئی۔ مگر عنانِ حکومت باغیوں کے ہاتھ نہ آئی بلکہ عباسیہ خاندان نے تخت سنبھالنے میں اس ہیجان انگیز صورت حال کا فائدہ اٹھایا۔ اس خاندان کے بادشاہوں (1257-750) نے عراق کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔

عباسیہ خاندان کی حکمرانی میں آٹھویں اور نویں صدیوں میں عرب دنیا کی معیشت اور تہذیب نے زبردست ترقی کی، بالخصوص سلطنت کے مرکز عراق نے۔ یہاں ایک وسیع علاقے میں فیوڈل سماج موجود تھا۔ زراعت میں تیزی سے ترقی ہوئی۔ تجارت بھی بہت بڑھی اور دستکاریوں کی بھی زبردست نشوونما ہوئی۔ ان سب باتوں نے سماجی استحکام کو زبردست تقویت بخشی۔ بلاشبہ عرب ممالک اُس زمانے میں دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ممالک تھے۔

زمین کی تقسیم کی خصوصی صورت یہ تھی کہ غیر مزروعہ قطعات بادشاہ کی ملکیت تھے۔ وہ یہ قطعات بیوروکریسی کو اُن کی سروسز کے صلے میں دیتا تھا۔ بقیہ زمین کے بہت بڑے رقبے ذاتی ملکیت میں ہوتے تھے۔ ان زمینوں پر کام کرنے والے کسان، سرکار کو محصول ادا کرتے تھے اور مالکوں کو لگان۔ ریاست کی آمدنی کا بڑا حصہ زمین کے محصول سے وصول ہوتا تھا۔ جو زمینیں سرکاری عہدے پہ منحصر ہوتی تھیں، ان کے مالکوں کو ہر حال میں فوجی سروس دینی ہوتی اور عباسیوں کی حکمرانی کے ایام میں انہیں اپنے ساتھ مسلح فوجی دستے لے کر جنگ میں شامل ہونا پڑتا تھا۔

پھر، سرکاری نوکری کے لیے عطا کردہ زمین رفتہ رفتہ ذاتی ملکیت بن گئی۔ یہ عمل نویں صدی میں رونما ہوا۔ اس عمل میں مذہبی اداروں کو دی جانے والی زمین (اوقاف) کے اضافے نے اہم کردار ادا کیا۔

کسانوں کی حالت روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ محصول، پہلے جنس کی صورت میں لیا جاتا تھا۔ مگر پھر اس کی وصولی نقدی کی صورت میں ہونے لگی۔ اُس کے نتیجے میں سودخوری آئی اور کسان مزید ابتر حالت میں زندگی گزارنے لگے۔

سلطنت کے دور دراز اور خصوصاً غیر عرب علاقوں میں بے چینی بڑھنے لگی۔ اور ساتھ ساتھ بڑے زمینداروں اور مرکزی حکومت کے درمیان چپقلش شروع ہوگئی۔ یہ زمیندار معاشی اور سیاسی خودمختاری چاہتے تھے۔ اس علیحدگی پسندی کا مقابلہ کرنے کے لیے حکمرانوں نے کوشش کی کہ ریاستی ادارہ مضبوط ہو مگر بادشاہ کی طاقت کا سرچشمہ یعنی مالِ غنیمت پر گزربسر کرنے والے عرب خانہ بدوشوں کی فوج غائب ہو چکی تھی۔ چنانچہ حکمرانی کی خستہ حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وسط

ایشیا اور ایران نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ بلوچستان بھی ایران کے ساتھ ہولیا۔

مامون الرشید 34-833ء میں مر گیا اور اس کی جگہ اُس کا بیٹا ہارون بادشاہ بنا۔ مگر اُس کے زمانے میں بھی سندھ اور بلوچستان میں بغاوتیں ہوئیں۔ مثلاً قلات اور، گنداواہ کے لوگوں، اور سندھ کے میدوں (ماچھی اور مہانڑوں) نے بغاوت کی۔ جنھیں اُس نے کچل دیا۔

یوں 976ء تک بلوچستان میں عربوں کی حکومت کا دور رہا جس کے بعد یعقوب بن لیس صفاری نے بلوچستان میں صفاریوں کی وہی ڈھیلی ڈھالی حکومت قائم کی جو ایران کی حکومت کے تابع رہی۔ صفاریوں کے بعد ہمیں بلوچستان میں سلجوقیوں کے برائے نام اثرات ملتے ہیں۔

ریفرنسز

1۔ یحییٰ امجد۔ ''وسطی عہد''۔ صفحہ 429

2۔ براہوئی، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر۔ ''بلوچستان میں عربوں کی فتوحات اور اُن کی حکومتیں''۔ 1990ء۔ زمرد پبلی کیشنز مستنگ۔ صفحہ 27

3۔ قلیچ بیگ۔ ''چچ نامہ''۔ صفحہ 108

4۔ قلیچ بیگ۔ ''چچ نامہ''۔ صفحہ 68

5۔ یحییٰ امجد۔ ''وسطی عہد''۔ صفحہ 435

6۔ سبطِ حسن۔ ''پاکستان میں تہذیب کا ارتقا''۔ صفحہ 152

7۔ The Rise of Fudalism in Sindh کے نام سے ڈاکٹر فیروز احمد کا آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھا گیا مقالہ۔

بلوچستان، مابعد خلافتِ اسلامی

ہباری دورِ حکومت (855-1010) کے آخر میں ریاست مکران، ریاست مشکے اور ریاست توران خود مختار ریاستیں تھیں۔ ایران اور پاکستان میں منقسم مکران سے قبل دونوں مکران ایک ہوا کرتے تھے۔ اِس غیر منقسم ریاستِ مکران کا پایہِ تخت کیچ تھا۔ حیران کن بات ہے کہ یہاں کی سب سے بڑی پیداوار گنا تھا۔ جس سے سفید چینی بنائی جاتی تھی جسے عرب لوگ الفانید کہتے تھے اور ایرانی لوگ پانید۔ یہ چینی قریبی ممالک کو برآمد کی جاتی تھی۔ مکران کی بندرگاہ ''تیز'' تھی۔ (اب اس کا قرب وجوار چابہار 8 کہلاتا ہے)۔

بعد میں ریاستِ مکران نے اپنا پایہِ تخت پنجگور کو بنالیا۔ اس میں ایک کچا قلعہ تھا اور اس کے اردگرد خندق تھی۔ شہر کے اردگرد نخلستان تھا۔ شہر کے دروازے دو تھے۔ ایک کا نام ''بابِ تیز'' تھا۔ جس میں سے وہ سڑک گزرتی تھی جو کہ بندرگاہ تیز کو جاتی تھی اور دوسرے کا نام ''بابِ توران'' تھا جس سے نکل کر سڑک توران (خضدار) کو جاتی تھی۔ جی جی سٹرینج کے مطابق ''یہاں کے لوگ بلوچ تھے جو نام کے مسلمان تھے''۔ (1)

ریاست مشکے، ریاست مکران کے قریب ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔

نویں اور دسویں صدی کا مکران کسی صورت میں بیابان، الگ تھلگ اور پسماندہ علاقہ نہ تھا۔ جو لٹریچر ہماری دسترس میں ہے اُس کے مطابق بلوچستان کے ساحل انتہائی ترقی یافتہ اور گنجان آباد شہروں اور قصبوں کے مالک علاقے تھے۔ یہاں شہری زندگانی بہت متحرک اور بہت فعال تھی۔

دستکاری بہت ترقی یافتہ تھی۔شہروں کے اردگرد باغات اور ہرے بھرے کھیت تھے۔ یہاں بہت مصروف ہاربراور بندرگاہیں تھیں۔ایرانی دنیا،وسطی ایشیا،ملتان اورسندھ کے ساتھ تجارت عروج پر ہوا کرتی تھی۔

اُس زمانے میں سمندر پار تجارت کا جال دریائے دجلہ اورفرات کے دہانوں سے لے کر،عدن اورافریقہ کے مشرقی ساحلوں،اور جنوب مشرقی ایشیاءاور چین تک پھیلی ہوئی تھی۔اس بین البراعظمی تجارت کے نیٹ ورک میں بلوچستان کے ساحلی شہراپنی یکتااورنمایاں خصوصیت برقرار رکھے ہوئے تھے۔متحرک زندگانی کی ہلچل تھی۔کاسموپولیٹن اورمرکنٹائل زندگی، جہاں مختلف تہذیبوں،نسلوں اور مذہبوں کے لوگ باہم مل جل کر رہتے بھی تھے،تجارت بھی کرتے تھے اورآبادو آزاد بھی تھے۔(بلوچوں میں وسعت قلبی کی خصوصیت کس قدر پرانی ہے!)

یہ حقیقت ہے کہ بلوچ ساحل کی یہ بین الاقوامی حیثیت اُس کی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے بھی تھی کہ یہ شمال جنوب شاہراہ(جنوب میں افریقہ،شمال میں وسطی ایشیااور''دھند میں لپٹے مما لک'')اورمشرق مغرب شاہراہ(مشرق میں چین اورجنوب مشرقی ایشیااورمغرب میں ایرانی دنیا اور بحیرۂ روم کی بندرگاہوں) کے چوک اور چوراہے پہ واقع تھا۔مگر اس کی جغرافیائی اہمیت کے ساتھ ساتھ اُس کی اس حیثیت کوکم اہم نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہاں زبردست تجارتی مراکز تھے۔آبادی اورآبادکاری کی سرگرمیاں تھیں اورترقی وترقیاتی گہما گہمی تھی۔(2)

سلجوقیوں کے بعد دسویں صدی کے آخر میں ہم پرنصیرالدین سبکتگین غزنوی اور اس کے بیٹے محمودغزنوی نے حملہ کردیا۔مگر یہ حملہ غنیم کے گلے پڑ گیا۔بلوچ تو پھرقرار سے نہیں رہنے دیتا۔وہ خفتہ اورخفیہ حملوں میں یلغارگرکا خون کبھی زمین پرسوکھنے نہیں دیتا۔بلوچ غزنوی حکمرانوں سے لگاتار مدبھیڑوں میں تھے۔بلوچ اورغزنوی کے تعلقات کبھی بھی پُرامن نہ رہے۔توران اور مکران سال 77-976ءمیں غزنوی سبکتگین کی محدود حکمرانی میں آئے۔جب اُس نے 994ء میں خضدار پرحملہ کیا تو بلوچ افواج اُس کے خلاف لڑیں۔غزنوی،دسویں صدی کے اواخر تک ایران کے وسیع علاقے پرحکمران رہے۔

محمد اسماعیل دشتی نے اپنی کتاب''بلوچ۔تاریخ اورتہذیب'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ جب محمودغزنوی نے بلوچوں پرفوج کشی کی تو لشکر کی روانگی سے قبل وہ کمانڈر سے تنہائی میں ملا۔اور بلوچوں کے خلاف جنگ میں فتح کے حصول کے لیے حکمتِ عملی اور چال کی وضاحت کی۔اس نے اپنے کمانڈر سے کہا کہ''کرمان اور بلوچستان کے راستے میں ایک پہاڑی گھاٹی ہے۔اس گھاٹی کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بلوچوں کا قبضہ ہے۔اس وجہ سے ہماری شکست یقینی ہے۔لہٰذا مکروفریب لازمی ہے''۔یہ کہہ کراُس نے زہر سے بھری ہوئی شیشی نکالی اورکہا:''جب تم اصفہان شہر پہنچوتو اچھی اقسام کے سیب اتنی مقدار میں خریدو کہ جسے دس اونٹ اٹھاسکیں۔اوران سیبوں کوزہرآلود کرنے کے بعد دس اونٹوں پر لادواور بلوچستان کی طرف جانے والے تجارتی قافلوں اوران کے سامان کے ساتھ شامل کردو''۔اسمٰعیل دشتی کے بقول،کمانڈر نے یہی کیااوراُس پہاڑی گھاٹی پراپنے پہنچنے سے پہلے ان دس اونٹوں کوتھوڑی سی فوج کے ساتھ اس علاقے میں بھیج دیا۔بلوچوں نے اس فوج کوپکڑلیا اور تمام زہرآلود سیب کھالیے۔دوسرے دن محمودغزنوی کی فوج بلوچوں کی لاشوں سے گزرتے ہوئے،بغیرکسی مزاحمت کے بلوچستان پرقابض ہوگئی۔(3)

غزنوی نے 977ء میں ہندوستان پر حملے سے قبل جہلاوان کا علاقہ فتح کرلیا۔بہت بڑی دولت ہتھیالی اور سالانہ خراج کی رقم مقرر کرکے اس نے وہاں کے مقامی حاکم کو ہی وہاں کا حکمران بنادیا۔اورخود چلاگیا۔مگر جب محمودغزنوی کوکچھ وقت تک یہ خراج ملنا بند ہوگیا تو اس نے فوراً حملہ کردیا۔وہ پانچ لاکھ درہم تاوان لے گیا،خراج کا سارا حساب بے باک کیا اور پندرہ ہاتھی بطور''پیشکش'' وصول فرمائے۔(4)

واضح رہے کہ وسط ایشیائی فیوڈل بادشاہوں میں محمود پہلا شخص ہے جس نے سلطان کالقب اختیار کیا۔ورنہ سب خودکوخلیفہ وغیرہ کہلواتے تھے۔(خلفیہ بہت بڑا مذہبی غلاف لفظ تھا) مگر سلطان لقب کے باوجود محمودکوبھی مشرف بہ اسلام کرنے کی بہت بہت کوشش کی گئی۔999ء کے آخر میں عباسی بادشاہ نے اُس کوخلعت عطا کرکے''امین الملت'' اور''یمین الدولہ'' (سلطنت کا دایاں ہاتھ) کے خطابات عطا کیے۔(ہمیں اپنے امین کھوسہ کوامین الملت کہنا چھوڑ دینا چاہیے!)

مکران کا حاکم بھی اس امین اور یمین، غزنوی کو مالیہ دیتا تھا۔ سبی بھی گیارہویں صدی کے اوائل میں اس محمود غزنوی کے ماتحت آ گیا جس نے ملتان کا سارا علاقہ 1004ء میں فتح کر لیا۔ مگر اس ''سلطان'' محمود نے ابھی تک تو محض ہندوستان کے دامن ہی کو چھوا تھا، جہاں سے مال غنیمت کی محض بُو سونگھی جا سکتی تھی۔ اصل مال تو آگے تھا، اصل دولت تو پہاڑ کے اُس پار تھی۔ وہاں ایسے ایسے مندر تھے جن پر عقیدت مند ہندوؤں کی پشت ہا پشت کی دولت چڑھائی ہوئی تھی۔ سومناتھ کا مندر اُن سب سے ممتاز تھا۔ ہندوستان کے راجاؤں نے سومناتھ کے مندر کے لیے دس ہزار گاؤں وقف کر رکھے تھے۔ وہاں ایک ہزار برہمن دن رات پوجا پاٹ میں لگے رہتے۔ مندر میں دو سو من وزنی سونے کی زنجیر لٹکتی تھی جس میں گھنٹیاں آویزاں تھیں۔ 500 خوش الحان گلوکار عورتیں اور دو سو گویے ہر وقت موجود تھے۔ تین سو حجام یاتریوں کی داڑھیاں اور سر مونڈنے کے لیے مقرر تھے۔ کئی راجاؤں نے اپنی بیٹیاں سومناتھ پر چڑھا دی تھیں، جو رہتی بھی وہیں تھیں۔

مندر کی عمارت بہت کشادہ تھی اور اس کی چھت 56 مرصع ستونوں پر قائم تھی۔ سومناتھ کا بت پتھر کا تھا۔ اس کی لمبائی پانچ گز تھی۔ جس میں سے دو گز زمین میں اور تین گز باہر تھا۔ جس حجرے میں یہ بت تھا اس میں روشنی کا گزر بالکل نہ تھا۔ قندیلوں میں جواہر والماس جڑے ہوئے تھے اور ان کی جگمگاہٹ سے وہاں روشنی ہوئی تھی۔

چنانچہ محمود اُسی مندر پہ ''ہلہ بول'' ہوا۔ ''امین، یمین اور سلطان'' محمود نے برصغیر پر 17 حملے کیے۔ (ابدالی نے 9 حملے کیے تھے)۔ اس ترک حکمران نے کرنگر کوٹ کے مندر کو لوٹا جہاں چاندی سونے اور جواہرات کے انبار پڑے تھے۔

غزنی واپس پہنچ کر محمود نے ایک بڑی ضیافت کا اہتمام کیا، اور ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت کی نمائش کی۔ سرداروں اور امرا کو قیمتی تحفے دیے۔

چنانچہ ہر سال موسمِ سرما میں ہندوستان پر حملہ کرنا اُس کی عادت ہوگئی۔ وہ اپنے خزانے بھرتا، فوج کو شہر میں قتل و غارت گری سے شاداں کرتا اور موسم بہار میں پہلے سے زیادہ دولت لوٹ کر واپس چلا جاتا۔ قیمتی مال بٹنے کی وجہ سے اس کی فوج میں ہر سال اضافہ ہو جاتا تھا جس میں ایرانی،

ترک اور افغانی باشندے ہوتے تھے۔

اور بالآخر 1024ء میں اس نے سومناتھ کے ''مہاپوتر'' مندر پر حملہ کر دیا جو اپنی بے شمار دولت کے سبب پورے ہندوستان میں مشہور تھا۔ ول ڈیورانٹ کے بقول اس نے ''شہر سومناتھ میں پچاس ہزار مکینوں کو قتل کر ڈالا اور اس کی ساری دولت لوٹ لی''۔ کیا کریں پاکستان کی رجعتی حکومت اِس ناترس آدم خور غزنوی سے اس قدر متاثر ہے کہ اس کے نام سے میزائل تک بنایا۔ اُس نے سومناتھ کے مندر کو بھی توڑ پھوڑ دیا اور اُس کے صندل کی لکڑی کے عظیم دروازے کو بھی غزنی لے گیا(5)۔ اس ''بت شکن'' نے بت کا کچھ حصہ تو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور باقی کو مع زر و جواہرات کے غزنی بھجوا دیا۔

ہیرے جواہرات کے وہ سارے ڈھیر اُس کے خزانے میں پڑے رہے۔ ہیروں اور جواہرات کے جو خزانے اُس نے اکٹھے کیے، وہ مرتے دم تک اُن کی طرف دیکھتا رہا۔ مؤرخ فرشتہ لکھتا ہے:

''محمود غزنوی نے اپنی موت سے دو روز پہلے جواہرات اور اشرفیاں شاہی خزانے سے نکلوا کر اپنے محل میں ڈھیر کرا دیں۔ رنگا رنگ قیمتی ہیروں سے باغ، جنت کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ان پر حسرت کی نظریں ڈال کر دھاڑیں مار مار کر روتا رہا...... اور اس خزانے سے کسی کو پھوٹی کوڑی بھی نہ دی۔ پھر اس نے شاہی اصطبل سے گھوڑے، اونٹ اور ہاتھی نکلوائے۔ اُن کو دیکھ کر بھی وہ دھاڑیں مار مار کر روتا رہا''۔

لالچ اور طمع کا یہ مرید تاریخ میں گم ہو جاتا مگر اس کی لالچ اور حرص نے اُسے دنیا کی تاریخ کے صفحات میں زندہ رکھا۔ پاکستانی بنیاد پرست حکومت کے علاوہ اُس کے فکری باڈی گارڈ فردوسی نے اُسے زندہ رکھا ہوا ہے۔ ہوا یوں کہ اس نے بہت بڑے شاعر فردوسی سے اپنی تعریف میں شاہنامہ لکھنے کی فرمائش کی اور صلے میں فی شعر ایک اشرفی دینے کا وعدہ کیا۔ تیس برس کی محنت کے بعد فردوسی ساٹھ ہزار شعر لکھ کر لایا۔ محمود حریص ایک کتاب کے لیے ساٹھ ہزار سونے کی اشرفیاں دینے میں ہچکچایا اور سونے کی بجائے چاندی کے ساٹھ ہزار دینار دینے لگا۔ فردوسی نے دیناروں کا

لینا منظور نہ کیا اور مایوس ہو کر فارس میں اپنے وطن کو چلا گیا۔ کچھ دنوں بعد محمود اپنی غلطی پہ پشیمان ہوا اور ساٹھ ہزار سونے کی اشرفیوں سے لدے اونٹوں کی قطار فردوسی کے پاس بھیج دی۔ مگر اب کیا ہوتا۔ اِدھر محمود کے لوگ اشرفیوں کی تھیلیاں لیے شہر میں داخل ہو رہے تھے اور وہاں فردوسی کا جنازہ شہر سے باہر قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔

فردوسی کے علاوہ محمود کو تین اور آدمیوں نے بھی تاریخ میں زندہ رکھا: اُس کے دربار کے فلاسفر اور مؤرخ البیرونی نے۔ دوسرا ہمارے علامہ اقبال نے۔ اقبال نے اپنے شعروں کے ذریعے محمود غزنوی کے ایاز نامی لڑکے سے عشق کو بھی شہرتِ دوام دے دی (نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں)۔ پھر غلام اور سلطان (ایاز، اور محمود) کو ایک ہی صف میں کھڑا کر کے بدترین غلامی کو شاعری میں بند کر کے گلوریفائی کرنے کی کامیاب کاروائی بھی اُسی نے کی۔ لوگ صدیوں تک اُس کے ''نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز'' والے واہمے کا شکار رہیں گے!!

محمود کا نام زندہ رکھنے کے لیے چوتھے آدمی کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ اُس بڑے انسان کو ذلیل وخوار کرنے کے باعث محمود تاریخ میں زندہ رہے گا۔ یہ وہ شخص تھا جو انسانی دلیل کی طاقت پر ایمان رکھتا تھا۔ اس کی کتابوں کے دو تہائی سے زیادہ حصے مافوق الطبعیات، اخلاقیات اور منطق پر ہیں۔ اس کی اہم ترین کتاب Cannon of Medicine ہے جو فزیشن کے فریضے سے شروع ہوتی ہے۔ پہلے انفرادی مریض کو سمجھنا، پھر مریض کی تکالیف اور بیماری کی وجوہات کا تجزیہ کرنا اور اس کے بعد علاج شروع کرنا۔ اس نے پودوں اور ان سے کشید کردہ مواد کو علاج کے بطور تجویز کیا۔ اس نے تجارتی جال کا نقشہ بھی کھینچا کہ کس طرح یہ ادویات مشرق وسطیٰ، فارس اور وسطی ایشیا میں آتی ہیں۔

یہ بڑا آدمی ابنِ سینا تھا، جس نے گیلن اور ارسطو کے فارمولوں میں ایشیائی دنیا کے اندر موجود طبعی علم شامل کر دیا۔ اُس جیسا فلاسفر ایک توسیع پسند، اور جہالت پھیلانے والی بادشاہت کو بھلا کہاں گوارا ہوتا ہے۔ چنانچہ ابن سینا' محمود غزنوی کی تیزی سے پھیلتی سلطنت اور تیزی ہی سے

پھیلتی جہالت سے فرار ہو گیا۔ محمود نے ابنِ سینا کو پناہ دینے والے بادشاہوں کو خط لکھے کہ وہ اُس فلاسفر کو اُس کے حوالے کر دیں، اس لیے کہ وہ اُسے اپنے دربار کا زیور بنانا چاہتا ہے۔ حالاں کہ ابنِ سینا کو تو پتہ تھا کہ وہ رجعتی شخص اُسے اپنی سلطنت کا زیور تو کیا بنائے گا' اُس سلطنت کی جیل کا زیور بنائے گا۔ ابنِ سینا اور اس کا وفادار شاگرد جوز جانی محمود کی سلطنت کے کناروں پر ایک دارالحکومت سے دوسرے دارالحکومت میں بھٹکتے رہے۔ وہ لکھتا ہے:

''میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں کہ کوئی شہر مجھے جگہ نہیں دے سکتا۔ مگر میری قیمت اتنی بڑھی کہ ہر خریدار نے مجھے بیچ ڈالا۔''(6)

******

محمود نے سومناتھ کے بعد بلوچستان کے گنداواہ کو فتح کیا تھا۔ ہماری پیداواری قوتوں کی ساری بڑھوتری ایک بار پھر خاک میں مل گئی اور ہمارے طبقاتی نظام کی شکل ایک بار پھر اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف دھکیل دی گئی۔

******

آخری غزنوی بادشاہ خسرو ملک کو 87-1186ء میں محمود غوری نے شکست دی اور غزنوی لٹیری سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ پھر ہم پر یہی لٹیرا غوری مسلط ہو گیا۔ بلوچ کے لیے ایک اور ڈاکو، مگر ہماری بے پردہ حکومت کے لیے ایک اور ہیرو۔ ایک اور میزائل بنایا گیا اور اُس پہ غوری کا نام رکھ دیا گیا۔ ہر لٹیرا اِن کا ہیرو بن جاتا ہے۔ ہر غزنوی، غوری، بابر، عالمگیر اور جیکب کے ہاتھوں ہمارے شہروں پہ یادگاروں کی ابدی بدنمائی پاتے رہے۔ بدقسمتی اور کیا ہوتی ہے؟

غزنوی حکومت ختم کرنے کے بعد غوری والا محمود پہلے پہل تو غزنی پر قابض ہوا اور اس کے بعد دولت وشہرت کی پیاس اُسے برصغیر گھسیٹ لے گئی۔ اس نے ملتان، اُچ اور پشاور فتح کر لیے۔ غوری شہزادے غیاث الدین کے دور (1157-1207) میں مکران میں ہوت قبیلے کا تاج الدین نامی شخص حکمران تھا۔ جہلاوان بھی اُسی کی کھیتی بنا۔

غوریوں کے بعد نصیر الدین قباچہ قابض ہو گیا۔ جس کے بعد بلوچستان ان علاقوں میں

سے ایک بنا جو شمس الدین التمش کے مقبوضہ جات تھے۔ یہ بات 1225ء کی ہے۔

غزنوی سلطنت کے مٹنے کے بعد سومرہ قوم کے سردار بن سو مار نے سندھ میں ایک خود مختار سلطنت قائم کی۔ بلوچستان میں کچھی کا علاقہ اس میں شامل ہوگیا۔ سومرو لوگوں نے تقریباً 300 برس تک سندھ پر حکومت کی۔ وہ برائے نام دہلی کے سلاطین کے ماتحت تھے (اور بلوچ برائے نام اُس کے ماتحت تھے)۔

******

مشہور سیاح اور مؤرخ مارکو پولو تیرہویں صدی کے اواخر میں چین سے گزر کر بلوچستان پہنچا تھا۔ اس نے لکھا، ''بلوچستان ایک آزاد خطہ ہے اور یہاں کے باشندے تجارت سے وابستہ ہیں......ان کی معیشت کا زیادہ تر انحصار اشیا کی درآمد و برآمد پر ہے''۔

1223ء میں چنگیز کے بیٹوں میں سے چغتائی خان مکران تک گھستا چلا آیا۔ چنگیزوں کی گزرگاہ کی نشانیوں میں اب بھی نچارا، اور پندران کے درمیان ''چنگیز خان کی چٹان'' موجود ہے۔ سلویا، اے میتھسن کا دعویٰ ہے کہ بلوچوں نے مشہور ڈش ''سجی'' انھی چنگیز خان کے منگولوں سے سیکھی۔(7)

کچھ عرصہ بعد جنوبی بلوچستان دہلی کے سلطان التمش کے قبضہ میں آیا مگر یہ جلد پھر منگولوں کا ہوا۔

ادھر 1250ء میں سبی کے علاقے نے خود کو ملتان کے لنگاہ قبیلے کے سربراہ رائے سہرا کے پاس دیکھا۔ جب سومرہ پر سمہ خاندان نے فتح پائی تو ان کے کسی فکری باڈی گارڈ نے انھیں جام کا لقب عطا کردیا۔ سمہ اور سومرہ دونوں حکومتیں جھلاوان پر بھی حکمران تھیں۔

چودھویں صدی کے اواخر میں 63 برس کا بڈھا امیر تیمور عراق، ایران، آذربائیجان اور آرمینیا کو فتح کرتا ہوا سمرقند میں داخل ہوا۔ اُسے تاراج کرنے کے بعد اُسے ہندوستان کی دولت کی مقناطیس نے اپنی طرف کھینچا۔ ایک کونے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کی بجائے اُسے ہندوستان قبضہ کرنے کی سوجھی۔ چنانچہ دریائے اٹک کو پار کر کے وہ ستلج جا پہنچا۔ ہندوستان مار کر وہ مغرب میں

روس، اور مشرق میں چین پر حملہ آور ہوا۔ 1393ء میں اس نے بغداد قبضہ کرلیا۔(8) تیمور 1336ء میں سمرقند کے جنوب میں برلاس ترکوں میں، پیدا ہوا تھا۔

تیمور کا پوتا پیر محمد 1398ء میں قندھار کی جانب سے کوہِ سلیمان پہ حملہ آور ہوا جو کہ ابھی تک آزاد تھا۔ وہ سیستان و بلوچستان کی حکمرانی کرتا ہوا مری پہاڑوں سے ہوکر ملتان پر ٹوٹ پڑا۔ سلطان محمود ثانی دلی کی بادشاہی چھوڑ کر بھاگ کر کسی مسجد کا ملاّ بن گیا ہوگا اور ترکوں نے مکمل ایمانداری اور یک سوئی سے دل کھول کر دہلی کو لوٹ لیا۔

اُدھر تیمور لنگ (اسے بلوچستان نے ہی لنگڑا کردیا تھا) کے بیٹے میران شاہ نے ایک فوجی مہم خاران اور خضدار کے راستے مکران تک بھیج دی اور وسطی اور مغربی بلوچستان فتح کر ڈالے۔ (ہائے رے شال! تم نے کیا کیا وحشی پیدا کیے!)

ہم نے دیکھا کہ ان صدیوں میں بلوچستان کے ساحل ایک سے زیادہ خارجی حکمرانوں کے تحت رہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے خارجی حکمران تھے اور چوں کہ وسطی ایشیا سے متواتر فتوحات والی بڑی بڑی لہریں چل رہی تھیں اس لیے یہ چھوٹے حکمران مختلف فاتحوں کو خراج دینے پر مجبور تھے۔ یہ فاتح تھے: سلجوق، غزنوی، غوری اور منگول۔ ظاہر ہے کہ براعظم میں بڑھتی ہوئی اس بدنظمی اور عدم تحفظ کی وجہ سے تجارت بھی محفوظ سرزمینوں کی طرف منتقل ہوئی۔

واسکوڈی گاما کے راہنما اور مصنف احمد بن ماجد نے اس علاقے کی خوبصورت بندرگاہوں کو بیان کرنے کے لیے کئی صفحے مخصوص کیے۔

''بحرین: ماہی گیری کے لیے مشہور۔ سُحر: کے اردگرد کئی گاؤں اور سرسبز درخت ہیں، مسقط: دنیا کی مشہور ترین بندرگاہ جس کا ثانی پورے جہاں میں نہیں ہے اور ''جہاں تجارت کی اتنی اچھی اشیا ملیں گی جو اور کہیں نہیں ملتیں۔ جہاں سندھ، مکران، ہند، ہرمز اور مغرب سے آنے والا تجارتی سامان خرید اور بیچا جاتا ہے''۔

یہیں، اسی سرگرم سمندری ٹریفک اور زندگانی کے درمیان بلوچستان کا مکران تھا۔ جہاں ''ہندی لوگ پارس والے لوگوں کے ساتھ اکٹھے رہتے تھے''۔ اور جہاں کے ساحلوں پر عرب لوگ

مشرق ومغرب سے اپنے بحری جہازوں سمیت آتے جاتے تھے۔

تیموری شہزادوں نے ایک صدی تک وسط ایشیا اور خراسان پر حکومت کی ۔ اس کے بعد شمالی ایشیا میں ازبکوں کا اٹھنے والا طوفان تیموری حکومتوں کا صفایا کر گیا۔ سلطان حسین مرزا اس تیموری خاندان کا آخری نشان تھا جس کی ہرات اور قندھار پر حکومت تھی۔ امیر ذوالنوں اسی شہزادہ کی طرف سے قندھار کا حاکم تھا۔ جس نے رند اور لاشار کی جنگ میں پہلے رندوں کی طرف داری کی تھی۔ اور بعد میں رندوں کو بھی بھگا کر مشرقی بلوچستان پہ قابض ہوا۔

ریفرنسز

1۔ جی بی سٹرینج/ محمد جمیل الرحمٰن۔'' جغرافیہ خلافت مشرق''۔1987ء۔سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔صفحہ 294

2۔۔ویلوپرا۔ایف پی

From Middle Ages to the 16th Centruey A.D Between Space and Time,1996 Italin Scientific Publishers,Naples,Page 634.

3۔ دشتی ،محمد اسماعیل / صادق بلوچ۔'' بلوچ تاریخ اور تہذیب''۔ 1999ء۔ فضلی سنز لمیٹڈ ۔ صفحہ 138

4۔جھالاوان گزیٹیئر ۔صفحہ 35

5- میکمن ، جارج/انور رومان۔'' شمال مغربی پاکستان اور برطانوی سامراج''۔ 1979ء۔ گوشہ ادب کوئٹہ۔صفحہ 67

6- سٹیورٹ، گورڈن ۔2008۔When Asia was the world۔Da Capo Press۔صفحہ 49۔53

7۔سلویا،اے میتھے سن،''ٹائیگرز آف بلوچستان''۔1975ء۔آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ صفحہ 139۔

8۔رشید،احمد۔The resurgence of Central Asia Islam or Nationalism ریڈ بکس لندن۔1994ء۔صفحہ 14۔

بلوچ کلاسیکل عہد

بلوچ کلاسیکل عہد

بلوچ بہت عرصے تک ایک ہزار برس قبل کے فارسی کے نامور شاعر ابوالقاسم فردوسی کے اِن اشعار کو اپنا منبع اور ابتدا سمجھتے تھے:

سپاهے زگردانِ کوچ و بلوچ
سگالیده جنگند مانندِ غوچ
کسے در جهاں پُشت ایشاں نه دید
زِآهن يك انگشت نامه پدید
سپید ارِشاں اشکش تیز هُش
که بارائے دل بودو بامغز هُش
درفشش بیاورده پیکر پلنگ
همی از درفشش بیارند جنگ

اور آفاقیت ہماری اِس نزدیک بینی پہ قہقہے لگا کر ہنستی رہی۔ آج تک ہم بلوچ اس بحث میں پڑے رہے کہ ہماری زبان کی ساخت و پرداخت کیا ہے؟ ہم پہلوی ہیں، دہلوی ہیں، دراوڑی

ہیں، یا آریائی؟......ہمیں سو سال سے اس سوال میں الجھائے رکھا گیا ہے کہ آیا ہم حلب سے حب چوکی آئے ہیں یا کیسپین سے کلات آئے؟

سائنس ہاتھ میں نہ ہو تو انسان بہت ابتدائی جانداروں جیسا ہوتا ہے۔ یہی ہمارے ساتھ ہوا۔ چوں کہ ہماری دسترس میں صرف پانچ سو برس قبل کا بلوچی ادب رہا ہے اس لیے ہم چاکر رند کے عہد ہی کو اپنی ہست و بود کا نقطہ آغاز گردانتے چلے آ رہے ہیں۔ جب کہ اُدھر مہر گڑھ تہذیب حیرانی میں کھڑی ہماری بے علمی کو کوس رہی تھی۔

جی ہاں، ہم پانچ سو سال کے بجائے گیارہ ہزار سال پرانے لوگ ہیں۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ گو کہ انسانوں میں چھوٹی موٹی نقل مکانیاں ہوتی رہتی ہیں مگر پورے بلوچ کو کسی اور براعظم سے ریڑھی پر لا دکر یہاں پٹخ نہیں دیا گیا۔ بلوچ یہیں کا باشندہ اور باسی ہے۔ شمال، یا شمال مغرب سے کسی بھی قسم کی بڑے پیمانے کی ہجرت، مہاجرت اور مہاجر تھیوری، غلط ہے۔

دلچسپ یہ ہے کہ بلوچوں پر کی گئی فردوسی کی شاعری تو قدیم زمانے سے ملتی ہے، مگر خود بلوچوں کی اپنی شاعری فردوسی کے بھی نصف ملینیم کے بعد والی ملتی ہے۔ ہمیں بس رِند و لاشار عہد کی بلوچی شاعری دستیاب ہے۔ بلاشبہ وہ ایک زبردست شاعری ہے۔ بالغ لٹریچر کا چھلکتا جام ہے۔ اس قدر امیر، اس قدر متنوع، اس قدر پُر معنی، رنگین اور متغزل، کہ جی خوش ہو جائے۔

سولھویں صدی کا بلوچ کلاسیکی عہد چاکری عہد سے منسوب ہے۔ اور اس عہد میں جو ادب تخلیق ہوا وہ لاثانی اور بے نظیر ہے۔ یہ ادب بلاشبہ بلوچی لٹریری ہسٹری میں سب سے زیادہ جمالیاتی، متنوع اور بامعنی ادب ہے۔ رزم و بزم و طرب اور پھر ماتم کے پوشوں میں لپٹا بہت ہی دل کھینچنے والا ادب۔ اور چوں کہ ادب اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے، اس لیے یہ سارا دور رنگوں جنگوں اور نعروں نغموں سے بھرا دور تھا۔ اور فتح کے شادیانے بجانے اور شکستوں کے زخم چاٹنے کے سارے مظاہر سے بھرا یہ عہد چاکر سے وابستہ ہے۔

چاکر، بلوچ قوم کی محبوب ترین ہستی بھی ہے اور متنازع ترین شخص بھی۔

مگر، یہ بات بہت ہی غور طلب ہے کہ چاکر کے عہد میں بلوچی زبان کوئی ''گوخوئی''

(گھٹنوں کے بل چلنے) کی عمر میں نہ تھی بلکہ وہاں تو وہ ایک متشکل، بالغ اور ترقی یافتہ زبان تھی۔اور دنیا کی دیگر بڑی زبانوں کے ہم پلہ ادبی، ثقافتی اظہار کر رہی تھی۔اور یہ تو معلوم بات ہے کہ کوئی بھی زبان، بنی بنائی شکل میں انسان کو نہیں ملی۔ بلکہ وہ تو صدیوں کی تجرباتی کوششوں سے پیدا ہونے والی نطقی روایت کے نسل در نسل منتقل اور متغیر ہوتے رہنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔اس کے تغیر وتبدل اور تراش خراش کے دامن میں صوتی آنکھ مچولی ہی نہیں، تہذیبی سفر، نفسیاتی کرشمہ، اور سیاسی وسماجی نیرنگیوں کی داستان بھی موجود ہیں۔

چنانچہ، ہماری زبان بھی چاکر کے عہد ہی میں اچانک آسمان سے نہیں اتری تھی۔ بلکہ یہ بھی دنیا کی دیگر ساری زبانوں کی طرح اپنے سے پہلی زبانوں کے الفاظ اور فریم میں، پیداواری عمل کے دوران ہزاروں برس تک بڑھتی پھلتی اور پھولتی رہی۔یعنی خود چاکر کے عہد کی بلوچی ہزاروں برس پرانی تھی۔

میر جلالہان کی موجودگی، بلوچی زبان کی بہت مضبوط اور پکی اورل پوئٹری کی بنیاد پر یقینی ہے۔اورل پوئٹری کی باتیں سو فیصد سائنسی اور حتمی تاریخی باتیں تو نہیں ہوتیں مگر یہ اپنی قوم کی تاریخ کو جمالیاتی بیساکھیاں مہیا کیے رکھتی ہے۔یونان اور روم اُس کی مثالیں ہیں۔

اسی مضبوط اور ایک دوسرے سے بہت دور واقع بلوچوں کی اورل پوئٹری چاکری عہد کے بارے میں ہماری بڑی اور تقریباً واحد ریسرچ ریسورس ہے۔اس کے مطابق شیہک نے اپنی ایک بیٹی باہر خان ہڑ رند کے عقد میں دے دی جو کہ میر عالی کا چھوٹا بھائی تھا۔(میر عالی نلی کی جنگ میں کام آیا تھا جس کے تین بیٹے حسن مولانغ ،محمد اور ہارین تھے)۔شیہک کی اسی زوجہ کے بطن سے بیورغ پیدا ہوا۔شیہک نے اپنے بیٹے چاکر کی شادی گل محمد رند کی بیٹی شہناز سے کر دی جس سے چاکر کے تین بیٹے ہوئے (شھذاذ، اللہ داد، اورشیہک)۔(1)

ہماری اورل پوئٹری کے مطابق کچھ بلوچ طائفے مکران سے مشرق کی طرف چلے آئے۔ وجوہات میں ہمسایہ سرزمین سندھ کی زرخیزی اور سمہ حکمران کے دربار کی شان وشوکت کے بارے میں عجیب وغریب کہانیاں ہوں گی۔ اسی طرح ہندوستان کی دولت وثروت کے افسانوی بیانات

دور دور تک پھیل گئے تھے۔نیز مکران کی ویرانیت وخشک سالی بھی اُس کی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔

نقل مکانی کرنے والے یہ ''کچھ'' طائفے کلانچ سے کیچ پہنچے اور 1485ء کو انھوں نے مکران کو الوداع کہا۔

اس سینہ بہ سینہ چلتی بلوچی شاعری کو ڈیڑھ سو برس قبل لانگ ورتھ ڈیمز نے جمع کیا اور اسے چھاپ دیا۔اُس نے اس لڈو بوژ (مائیگریشن) کی ہم عصر شعری داستانوں میں سے ایک کو جمع کرلیا:''اُن جیالوں نے اپنی محبوب بیویوں سے کہا: اپنے ایوانوں سے نیچے اتر آؤ، اپنے غالیچوں اور خوبصورت تکیوں کو لپیٹ لو۔اپنے پیالوں اور مکرانی قدحوں کو لے آؤ۔۔۔فیاض رندوں نے اپنی قبائیں اور پگڑیاں پہن لیں۔لمبی لمبی سرخ جوتیاں پیروں میں ڈالیں۔خود، ڈھال، تیر کمان، خنجر اور جملہ ہتھیاروں سے خود کو مزین کیا۔تب 40 ہزار شہسواروں نے میر کی آواز پر لبیک کہہ کر گھوڑوں کو ایڑ لگا دی''۔لاکھوں کی تعداد میں نہیں (کہ اس کے آثار وثبوت کہیں موجود نہیں ہیں)۔

کلاسیکل شاعری، واقعات کے گرد بہت مزے دار الفاظ وتغزل بھرے جملوں کو لپیٹ لیتی ہے'ادبی چاشنی سے بھرپور ان ابریشمی تہوں کو ہٹا ہٹا کر آپ حقائق کے چہرے کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

اب ذرا آیئے اُس وقت کے کلات کا تذکرہ کریں۔

کلات پر 1530ء میں ارغون خاندان حکمران تھا اور قندھار اُن کا پایہ تخت تھا۔1530ء میں ارغون حکمران ذالنوں بیگ کو مرزا کامران نے شکست دے دی......بلوچوں کے ایک سردار عمر خان میرواڑی نے تخت قلات پر قبضہ کرنے کے بعد مضافات پر توجہ دی۔واضح رہے کہ یہ اولین بار ہے کہ تاریخ میں ایک باقاعدہ بلوچ ریاست کا تذکرہ آیا۔

مگر، آگے ذرا ایک متنازع معاملہ ہے ۔ ہمارے پاس چار سورسز ہیں جن کے مطابق میر عمر خان اپنی شب وروز کی کاوشوں سے اپنی حکمرانی کو مضبوط بنانے میں مصروف تھا کہ اچانک مکران وکرمان سے بلوچ سردار شیہک رند اور گوہرام لاشاری ایک لشکر کے ساتھ نمودار ہوئے اور اپنے ہی بھائیوں پر ٹوٹ پڑے۔سردار عمر خان مارا گیا اور اس کی ماں، اپنے بیٹے بجار کو اپنے میکے مستنگ لے گئی اور وہیں پالا۔(2)

رند اور لاشار سردار تختِ قلات پر میر مندو خان رند کو بٹھا کر کچھی کی جانب بڑھے۔ پھر وہی بجار میرواڑی جوان ہوا تو باپ کا بدلہ لینے اور تختِ قلات پر قبضہ کرنے لشکر لے کر قلات پر حملہ آور ہوا۔ اس جنگ میں مندو (Mandav) مارا گیا۔ مندو کی قبر قلات کے مستنگی گیٹ کے قریب واقع ہے۔ بجار نے دشت گوران، نال، ہزار گنجی اور ناچ' اور وڈھ کو دوبارہ فتح کر لیا۔(3)

اس سلسلے میں ہماری دسترس میں آخوند محمد صدیق کی فارسی میں لکھی '' تاریخ ریاست کلات '' ہے۔ یہ کتاب اُس نے 1858ء میں لکھی تھی۔ وہ اس کتاب کے صفحہ نمبر 3 میں لکھتا ہے:

''۔۔۔ چوں کہ چاکر بلوچ سردار رند ہا و گوہرام لاشاری از ملکِ مکران رو بہ کلات آورند پس از میروانی وشیہک پدرِ چاکر بلوچ جنگ واقعہ شد۔ لشکرِ بلوچ غالب آمد و عمر کشتہ شد۔ قبرِ عمر میروانڑیں تا حال در کلات موجود است۔ کلات را از میروانڑیں گرفت۔۔۔ بعد ازاں شیہک و چاکر رند و گوہرام و لاشاری بہم مشورت نمودہ برائے گرفتن ملک کچھی رفتند۔ چنانچہ چاکر رند و شیہک پدر چاکر است از راہِ بولان بملکِ ڈھاڈر پائیں شدند۔ و گوہرام سردار لاشاری ہا از راہِ مورہ بہ گنجابہ پائیں شدند۔ و بہ مندو بلوچ راتہ از قومِ رند ہا پڑی نامند در کلات حاکم کردہ رفتند''(4)۔

آخوند محمد صدیق کے اسی پیراگراف کو لالہ ہتورام نے بھی کوٹ کیا۔(5)

اس سلسلے میں ہمارے پاس ایک تیسرا حوالہ آغا نصیر خان احمد زئی کا ہے۔ اس نے لکھا کہ ''18 دسمبر 1512ء کو میر بجار میروانی کی قیادت میں لشکر نے میر مندو رند کے اونٹوں کے گلہ پر حملہ کر دیا۔ مندوانی لشکر اونٹوں کے بچاؤ کے لیے پہنچا۔ زبردست لڑائی ہوئی۔ مندوانی رند شکست کھا کر بطرفِ کلات پسپا ہو گئے۔ 23 دسمبر 1512ء کو میروانیوں نے کلات شہر کو محاصرہ میں لیا۔ میر مندو جنگ میں مارا گیا اور کلات پر بجار میروانی نے قبضہ کر لیا۔۔۔''(6)۔ اسی مصنف نے آگے لکھا: ''۔۔۔ اگلے دن 24 دسمبر کو بلوچی روایت کے مطابق نہایت احترام کے ساتھ میر مندو رند کی میت کو شہر کلات کے مستنگی دروازہ کی فصیل کے قریب دفنایا۔ بعد میں اس پر گنبد تعمیر کیا گیا۔ مقبرے کا گنبد محراب خان کے دورِ حکومت تک صحیح حالت میں تھا۔ بعد میں منہدم ہو گیا۔ اس وقت اس قبر کو مٹی کی ایک چار دیواری نے احاطہ کیا ہوا ہے۔ اس چار دیواری میں شہید عبدالکریم رئیسانی

جو میر محراب خان شہید کے ساتھ بلوچستان کی آزادی کا دفاع کرتے ہوئے انگریزوں کے ساتھ لڑائی میں 13 نومبر 1839ء کو شہید ہوئے، اُن کو بھی اسی مندو رند کے گنبد میں دفنایا گیا۔(7)

ہمارے پاس اس حوالے سے چوتھا حوالہ احمد یار خان کا ہے جس نے 1972ء میں اپنی کتاب ''مختصر تاریخ بلوچ و خوانینِ بلوچ'' کے صفحہ 35 میں اسی طرح لکھا ہے۔

البتہ اِن حوالہ جات اور بیان کے بالکل برعکس ایک دوسرا version میر الفت نسیم کا ہے۔ جس نے ''براہو جد گال جنگ'' نامی شاعری دریافت کی۔ جس میں اس پورے چاکر' مندو واقعہ کو چیلنج کیا گیا۔

بہر حال، آخری عمر میں بجار خان گوشہ نشیں ہوا۔ تخت درباری انتظامیہ کے حوالے کر کے آبائی مسکن ''نغاڑ سوراب'' میں جا بیٹھا اور وہیں فوت ہوا۔

اس گوشہ نشینی سے کلات کمزور ہوا اور مرزا کامران مغل نے موقع سے فائدہ اٹھا کر حملہ کر کے کلات پر بلا مزاحمت قبضہ کر لیا۔ ایک دلچسپ روایت بھی سنتے جایئے۔ مرزا کامران نے کلات کے مقتدرہ لوگوں سے حلف لیا کہ '' طرفین کسی آہنی ہتھیار، لکڑی یا پتھر وغیرہ سے ایک دوسرے کو مالی جانی نقصان نہیں پہنچائیں گے''۔

مغلوں نے ہر بیرونی قبضہ گیر کی طرح لوگوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے بغاوت کرنا چاہی۔ مگر وہ حلف؟ اُس کا کیا کرتے؟ تب بہت سوچ بچار کے بعد ایک تدبیر کر لی گئی۔ ابراہیم میرواڑی کی قیادت میں دوسو جوان ملاقات کے بہانے قلعہ میں داخل ہو گئے۔ ان کے پاس ''بیرزنی'' روٹیاں تھیں جن میں ریت بھر بھر کر کئی دنوں تک دھوپ میں سکھا کر سخت کیا گیا تھا۔ ان روٹیوں سے یہ بلوچ، مغل حکمران اور اس کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے۔ باہر سے بھی کمک پہنچی۔ اس طرح مغل حکمران کو ہلاک کر کے میرواڑی تخت پر قابض ہو گئے۔

ابراہیم نے اپنے نواسے میر حسن خان کو تخت پر بٹھایا۔ وہ خانِ بلوچ کے لقب سے تخت قلات پر بیٹھا۔ مگر مختصر سی مدت میں لاولد فوت ہو گیا۔ تب سرداروں اور معززین نے اپنے قدیم سالارِ قافلہ میر کمبر خان کے خانوادے کو یہ منصب دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ میر حسن خان کے جانشین

کے طور پر قبیلہ کمبراڑیں کے چشم و چراغ میر احمد خان کو خان بنایا۔اس طرح حکومت میرواڑیں خانوادہ سے کمبراڑیں خانوادہ میں منتقل ہوگئی اور اُس میں سے احمد زئی خاندان برسرِ اقتدار آ گیا۔(8)

آیئے تخت اور تاج کی بات چھوڑ کر عوام الناس کی بات کریں۔ بلوچ کی بات کریں۔ بلوچستان بھر کے عوام کو اپنی ہمیشہ والی نیم ترقی یافتہ کاشتکاری میں مصروف تھے۔نیز اُن کی زندگی کا ایک بڑا دارو مدار مویشی بانی پہ بھی تھا۔اور اِن دونوں ذرائع کا انحصار بارشوں پہ تھا۔اور بلوچستان پر بارشیں بہت کم مہربان رہی ہیں۔

جس علاقے بارش برسنے کی اطلاع آجاتی لوگ پینے کے تازہ اور میٹھے پانی اور چراگاہوں کے لیے اُن علاقوں کی طرف خانہ بدوشی کرتے تھے۔

ہماری صدیوں تک جاری خانہ بدوشی کی ایک وجہ موسموں کی شدت تھی۔موسم سرما میں سوراب، قلات اور کوئٹہ کا تقریباً سارا سرد علاقہ اپنے مال مویشی سمیت کچھی کے میدانوں کے موسم کا مہمان ہو جاتا۔اور مارچ' اپریل میں کچھی ان مہمانوں کو جلتے سورج کی جھلکی دکھا کر دوبارہ اپنے سرد علاقوں کی سلامی کے لیے ہانکتا۔

مکران کے بلوچ بھی اپنے جغرافیائی ماحول کے اتار چڑھاؤ کی مطابقت میں زندگی گزار رہے تھے۔ساحل تو سمندری حیات پہ زندہ تھا۔معمولی اور بہت فرسودہ سمندری تجارت ہوتی تھی۔اور بقیہ وطن اپنی شتربانی، کھجور کے باغات اور اناج کی معمولی کاشت پہ گزر بسر کرتا تھا۔

******

بلوچی اورل پوئٹری میں البتہ سبی کا خوب تذکرہ موجود ہے۔سبی ہر زمانے میں اہم تجارتی سیاسی انتظامی اور سماجی مرکز رہا ہے۔مگر پندرھویں صدی کا سبھی ہماری کلاسیکل ادب کا مرکز رہا ہے۔مگر پندرھویں صدی کا سبی ہماری کلاسیکل ادب کا مرکز رہا ہے۔مقامی آبادی کا تو خیر اس قدر تذکرہ نہیں ہے مگر یہ پندرہویں صدی کے اوائل میں درہ بولان سے ڈھاڈر اور سیوی آئے ہوئے رند قبائل کا زبردست ذکر ہے۔ان کے دوسرے فرقے لاشاری کا درہَ مولا کے راستے گنج آبہ (گنداواہ) اور گاجان پہ آباد ہونے کی تفصیلات موجود ہے۔سبی اور قلات کا واسطہ کندہار سے

تھا، جبکہ کچھی اور گنداوہ پر سندھ کے سمہ لوگ برائے نام حکومت کیا کرتے تھے۔

سیوی اور کچھی کا میدانی علاقہ نہایت ہی زرخیز اور شاداب رہا ہے۔تین بڑے بڑے سیلابی دریا وافر پانی کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھ نئی مٹی کی تہہ اس علاقے پر بچھا دیتے ہیں۔اس خطے میں ہزاروں برس قبل کپاس کاشت ہوتی تھی۔گنداواہ تو زرخیزی ہی کی وجہ سے گنج آبہ کہلاتا تھا۔ کچھی اور سیوی کا علاقہ گھوڑوں کی ایک زبردست نسل کے لیے بھی مشہور تھا۔

رند سیوی، شوران اور ڈھاڈر کے علاوہ نرمک، بارڑی، کرتہ، سنی اور شالی کچھی تک آباد تھے۔انھوں نے شہر بسائے ہوئے تھے' قلعے تعمیر کیے ہوئے تھے۔چاکر کے چچازاد بھائی میرہان کا قیام ڈھاڈر میں تھا۔ہیبتان کی سرکردگی میں میرالیوں (بلیدیوں) کے خیمے سبی کے موجودہ علاقے گلو شہر اور بکھڑو میں نصب تھے۔بیورغ کا ڈھاڈر اور مٹھڑی کے درمیان دریائے ناڑی کے مغربی کنارے پر پڑاؤ تھا۔بجار پُژ کی سکونت سیوی کے مشرق میں تلی کے پہاڑوں کے قریب تھی۔ نوہانیوں کا قیام سردار اومر کی قیادت میں درہ نلی کے قریب تھا جو کہ گاجان کے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔کہیری لوگ، کورزمین اور پلیجی کے میدانوں کی طرف تھے۔کورائی قبیلہ بھاگ میں تھا۔اور کھوسہ روجھان اور مانجھی پور کے قریب بستیاں بسائے ہوئے تھے۔(9)

رند اور لاشار، بلوچ کنفیڈریسی کے مضبوط ستون تھے۔میر شیہک کے تدبر اور بلوچ عوام کی بہادری نے جام نندہ (سمہ خاندان) سے کچھی کا علاقہ (سیوی سے لے کر کوہِ سلیمان تک) اور دریائے حب تک کا سارا علاقہ فتح کر لیا تھا۔

شیہک کے مرنے کے بعد چاکر سردار بن گیا۔رند اور لاشار کی آپس میں رشتہ داری بھی تھی۔میر چاکر کی دو بہنیں محترمہ بانڑی اور محترمہ مذی، لاشاری خاندان میں عبداللہ اور ھدے خان سے منکوحہ تھیں۔

رند و لاشار برسوں تک یہاں امن و امان میں رہے۔سردار اپنی سرداری میں خوش حال تھے۔اور عام آدمی محنت مشقت میں اپنی زندگی دھکیل رہا تھا۔فارغ اشرافیہ سیر و شکار میں مشغول رہتا تھا۔

اشرافیہ کی حالت مولائی شیدائی کے رومانوی انداز میں یوں تھی: ''سبی میں موجود بلوچوں کے پاس نو ہزار گھوڑے تھے۔'' (10) بھیڑ، بکری اور دنبوں کا تو کچھ شمار ہی نہ تھا۔ فیوڈلوں کی مستورات قلعوں میں رہتی تھیں۔ ان کے فرش قالینوں سے رنگین تھے۔ ان کے ہاں بالشت اور بستروں، چادروں کا رواج تھا۔ وہ یہ سارا سامان ایران سے منگواتے تھے۔ ان کے برتن زیادہ تر پیتل اور جست کے ہوتے تھے (اُن دنوں مکران برتنوں کی صنعت کاری کی وجہ سے مشہور تھا)۔ امیروں کے پاس سونے اور چاندی کے ظروف بھی تھے۔ جنگ کے وقت ان کے پاؤں میں چمڑے کے لمبے بوٹ، بدن پر زرہ اور سر پر فولادی نوکدار ٹوپی ہوتی تھی۔ ان کے گھوڑوں کی زین پر پیتل کا عمدہ کام ہوتا تھا۔ ان کے کمر بند اور چمڑے کا سامان خوشبودار چمڑے کا ہوتا تھا جس پر سبز مخمل پر زردوزی کا کام ہوتا تھا۔ وہ چمڑے کا یہ سامان ہرات اور شیراز سے منگواتے تھے۔ ان کے پاس تیر وکمان، نیزے اور تلواریں ہوا کرتی تھیں۔

شہسواری میں وہ با کمال تھے' چست و چالاک تھے۔ وہ باری باری حملہ کرتے تھے۔ جب کامیاب نہ ہوتے تو ایک دم حملہ کر کے دشمن کو پریشان کرتے تھے۔ ان کے گھوڑوں کو نعل لگے ہوتے تھے۔ ان کے پاس گینڈے کے چمڑے کی ڈھالیں ہوتی تھیں۔

جنگ سے فراغت کے زمانے میں اوپری طبقے کے لوگ سیر کرتے تھے، شکار کھیلتے تھے، گھڑ دوڑ کرتے تھے، عشق اور شاعری کرتے تھے، رقص اور موسیقی میں مشغول رہتے تھے۔ وہ چوغے، دستار میں، ہوتے تھے اور کمر میں قیمتی شالیں لپیٹ کر محفل میں بیٹھتے تھے۔ ان کی کمر میں خنجر آویزاں رہتے تھے۔ وہ زلفوں اور کپڑوں پر عطر لگاتے تھے جو وہ قندھار سے منگواتے تھے۔ ان کی محفلوں میں موسیقی ہوتی تھی، دنبیرہ اور سریندا ہوتے۔ ان کے اشعار زیادہ تر بہادری سے متعلق ہوتے تھے۔ امیروں کی عورتیں کمخواب اور زربفت کا قیمتی لباس پہنتی تھیں۔ اُن کی عورتیں کانوں میں سچے موتی کے زیور اور ناک میں زیور پہنتی تھیں۔ ہاتھوں میں مُندری، گلے میں چاندی کے طوق پہنتی تھیں۔

سردار فیاضی اور مہمان نوازی پہ پابند تھے۔ چاکر رند اور نوذبندغ لاشاری کی سخاوتیں اب بھی مشہور ہیں۔ نوذبندغ کو اسی لئے ''زرزوال'' (پیسہ لٹانے والا) کہتے تھے۔

مکران والوں کے قافلے سندھ اور گجرات تک مشک ختن، ادویات اور کھجور کی تجارت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بلوچستان چونکہ ایران اور ہندوستان کے درمیان واقع ہے اس لیے یہاں کے خطرناک پہاڑی دروں سے ان ممالک کا تجارتی سامان ہمارے خانہ بدوش ساربانوں کے قافلوں کے ذریعے چلتا تھا۔ چنانچہ خراسان اور قندھار کے خشک وتر میوے یہی لوگ ہندوستان کی منڈیوں تک پہنچاتے تھے۔ نقرہ وطلائی سکے ان کی گرہ میں بندھے ہوتے تھے۔

تجارت پر تو وہ آٹھویں صدی سے قابض تھے۔ ابنِ بطوطہ کے وقت بھی کلات، کیچ، سیوی، گنداواہ اور ملتان زبردست تجارتی منڈیاں تھیں۔ شام، عراق اور مسقط کا کیچ سے بیوپار چلتا تھا۔ یہاں سے بلوچ ساربان ان ممالک کی اشیاٹھٹھہ، گجرات بلکہ بڑودہ تک لے جاتے اور وہاں کی پیداوار سے اونٹ لاد کر لاتے۔ کلات، خراسان کے میوہ جات کا مرکز تھا۔ یہاں سے میوے درہ بولان سے گزر کر ہندوستان جاتے تھے۔ سیوی میں غزنی اور قندھار کا مال (جس کا سلسلہ ہرات، سمرقند اور بخارا سے تھا) آتا تھا۔ سیوی میں کپاس کی کاشت ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ بلوچستان کے دنبے یہاں سے ہندوستان اور سندھ کو فروخت ہونے کے لیے جاتے تھے۔ گنداواہ کے گھوڑے اور اونٹ ہندوستان میں ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے۔ ملتان اُس زمانے میں کپڑے کی تجارت کا مرکز تھا اور بلوچستان میں زیادہ تر کپڑا ملتان سے آتا تھا۔

تیر کمان اہم بنا، تلوار اہم بنی اور گھوڑا اہم بنا۔ اُس وقت کی جنگوں میں یہی ایف 16 ہوا کرتے تھے۔ تلوار اُس زمانے میں عام استعمال کا ہتھیار ہوا کرتی تھی............مصری، ہندی، اصفہانی، شیرازی۔

اس طرح کی سماجی زندگی میں جہاں سماج ابھی ترقی یافتہ نہ تھا، گھوڑے کی اہمیت مرکزی تھی۔ گھوڑی جان سے بھی پیاری تھی۔ سبک رفتار گھوڑی جنگ میں فتح کا ضامن ہوتی تھی۔ مالِ غنیمت میں گھڑ سوار کو پیدل سپاہی کی نسبت ڈیڑھ گنا حصہ دیا جاتا تھا۔ ایرانی، عربی (تازی)، سمند، ترکی............ہم اُس دور کی شاعری کی بے شمار مثالیں دے سکتے ہیں۔ مشکی، بور، کمیٹ......

یمن کے ''مہرہ بن حیدان'' قبیلے کا اونٹ اپنی برق رفتاری کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس وجہ

سے سواری کے تیز رفتار اونٹ کو ابھی بھی بلوچ ''مہری'' اونٹ کہتے ہیں۔

ہمارا کندھا اور ہمارا تیر کمان ، ہمارا کندھا اور ہماری بندوق ، ہمارا کندھا اور ہماری کلاشنکوف، ہمارا کندھا اور ہمارا راکٹ لانچر۔۔۔ ہمارے اپنے جغرافیائی محلِ وقوع اور بیرونی حملہ آوروں کی حریص نگاہوں نے ہمیں جنگی دیوتا کی رعیت بنائے رکھا ہے۔

اُس دور کی شاعری میں انتقام، مہمان نوازی، قول پہ پورا اترنا، اور پناہ میں آئے ہوئے کے لیے جان دینا بہت تاکید سے استعمال ہوتے تھے۔ یہ ہمارے سماج کی قدریں بھی تھیں اور شاعری کا حصہ بھی۔

لفظ کی اہمیت ہر سماج کی طرح بلوچوں میں بھی بہت زیادہ تھی۔ بلوچ کی Sensitivities میں جن عناصر کو اہمیت حاصل ہے ان میں لفظ اہم ترین ہے۔ ویسے بھی انسان نے تباہی کی جتنی خطرناک چیزیں ایجاد کی ہیں ان میں سب سے خطرناک اور طاقتور چیز ''لفظ'' ہے۔ خنجر اور نیزے خون کے دھبے چھوڑ جاتے ہیں ، تیروں کو دور سے دیکھا جا سکتا ہے ، زہر لیبارٹری میں معلوم کیا جا سکتا ہے مگر لفظ بغیر نشان چھوڑے تباہ و برباد کر دیتا ہے (11)۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ : دف کلائے ، دف بلائے۔ (زبان قلعہ بھی، زبان بلا بھی)۔

بلوچ تاریخ میں بھی اور بلوچ لٹریچر میں بھی رندی عہد شاید سب سے متحرک اور دل پذیر دور تھا۔ اس دور میں انسانی حیات ایک لحاظ سے ہمہ پہلو لپک جھپٹ میں نظر آتی ہے۔ سرگرم زندگانی نے ہر شعبہ کو سرگرم کیے رکھا تھا۔ اُس زمانہ میں بھی شعر و سخن کی زبان بلوچی تھی۔ بہت سی تحریروں میں یہ (شاید غلط) دعویٰ موجود ہے کہ میر چاکر کا بیٹا شہداد بلوچی کا شاعر تھا، محترمہ مہناز شاعر تھی۔ اسی طرح یہ بات بھی مشہور ہے کہ بیورغ کمال کا شاعر تھا۔ اور شعر و سخن اُس کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ اس کے علاوہ فیروز شاہ، ریہان، جاڑو اور بجار کے شاعر ہونے کی بات بھی مقبول رہی ہے۔ یہیں پہ ہمیں نچلے طبقے یا دوسرے درجے کے ''جت'' لوگوں کی شاعری بھی ملتی ہے۔ قویل جت، گوہر جتنڑ یں اور شلی جتنڑ یں۔ اس کے علاوہ قبیلوی طور پر ایک اور کمزور آدمی مریؔذ کی شاعری تو مظلومیت اور در بہ دری کی گہری اور جگر بُر ہے۔ الغرض، ایک عمومی ماحول تھا شعر و سخن کا۔ ہمیں

وہاں ہر واقعہ، ہر بڑے دربار اور اکٹھ کا بحث مباحثہ، عشق و محبت یا جنگ و جدال ایک رواں تبصرے کی صورت میں شاعری کے اندر ملتی ہے۔ یہ شاعری ڈرامہ کے انداز میں ہوتی ہے۔ جہاں ہر کردار اپنا مؤقف شاعری میں بیان کرتا ہے۔ اس سے لگتا ہے کہ یہ شاعری ایک تیسرا فرد کر رہا تھا اور ہر کردار سے اُس کی زبان میں بات کروا رہا تھا۔

اسی طرح اپنے ڈکشن کے اعتبار سے اس عہد کی کلاسیکل شاعری محض چند افراد کی شاعری نہیں ہے بلکہ زیادہ لوگوں کی ہے۔

یہ زمانہ وہ تھا جب بلوچ' اپنے رم، ریوڑ اور گائیوں اونٹوں کے گورم اور بگ کے ساتھ زرخیز زمینوں اور سرسبز چراگاہوں کے علاقوں میں آبادکاری کر چکے تھے۔ اور خانہ بدوشی والی مویشی بانی کے ساتھ ساتھ زراعت اور زراعت پر مبنی مویشی بانی بھی اختیار کر چکے تھے۔ اس پندرہویں صدی میں ایک طرف گنداواہ کی زرخیز زمین تھی اور دوسری طرف سبی وڈھاڈر کا دریائے چاکر، لہڑی ، دریائے بولان اور دریائے نیجی کے دہانے تھے۔ گندم کی فصل اچھی خاصی ہوتی تھی اور سبزے اور گھاس کی بہتات۔...... یہ سب کچھ ادب اور کلچر کے فروغ کے لیے ایندھن تھا۔

یہ دور دراصل ہماری کلاسیکل داستانوں کے عروج کا دور ہے۔ بلوچ کی ڈیڑھ درجن سے زائد عالمی سطح کی کلاسیکل داستانوں کا نصف اسی پندرھویں سولہویں صدی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ غنی اور دھنی کلاسیکل داستانیں میں نے اپنی کتاب ''بلوچی زبان وادب'' میں تفصیل سے دی ہیں۔ یہاں چلتے چلاتے، بس ایک آدھ فقرہ دیکھتے جایئے:

اس دور میں ہانی اور شہ مرید کی عشقیہ داستان بلوچی کلاسیک کی انگوٹھی کا نگینہ ہے۔ ایسی حسین، رواں، رنگین اور دلکش داستان کہ بس سنتے ہی جائیں' بس پڑھتے ہی جائیں۔

اسی طرح گوہر جتنڑ یں بلوچ تاریخ کی ایک فقید المثال خاتون ہے۔ قبائلی منافرتوں کے بھڑکتے شعلوں کو بجھا دینے میں اس کی شعوری کاوشیں رہی ہیں۔ ہمارا کلاسیکی ادب محترمہ گوہر کے بغیر بالکل تشنہ اور نامکمل سمجھی جائے گی۔

پندرہویں صدی کا یہ بلوچ سماج، نہ صرف یہ کہ طبقاتی تھا بلکہ اِسی طبقاتی بنیاد پر ذات

پات کا کریہہ نظام بھی قائم ہو چکا تھا۔ یہاں ایسے کئی پیشے تھے جن سے وابستہ لوگوں کو دوسرے درجے کا بلوچ سمجھا جاتا تھا۔اس ذات پات کے نظام کے خلاف تویل جت کی چیخ وفریاد پرمبنی بہت ہی خوبصورت شاعری ہے۔

ھَیوتان میرالی رند تھا۔اس دور کے بہت ہی حیران کن قول دینے والوں میں سے ایک وہ بھی تھا۔اس نے کہہ رکھا تھا کہ اگر کسی کا اونٹ اُس کے اونٹوں کے گلے (بگ) میں آجائے تو وہ اُسے واپس نہیں کرے گا۔اور پھر چاکر کا اونٹ اُس کے بگ میں۔مگر محترمہ ہانی اس چھڑتی جنگ کو روک دیتی ہے۔ایک بہت بڑی متوقع بدامنی، خیر سگالی اور بھائی بندی میں بدل جاتی ہے۔

اِس فیوڈل عہد میں ایک بہت ہی نمایاں رول بیورغ کا رہا ہے۔چاکر کا بھانجا بیورغ شمشیر کا دھنی اور ربابوشابکا آدمی تھا۔وہ رواج وروایت کا پاسبان، شجاعت وتدبر کا نشان اور فہم وتدبر کا ماہر تھا۔ایسے لگتا ہے کہ چاکر کا ابھار اور زوال بیورغ کے وجود کے گراف کے ساتھ ساتھ زیر اور بم ہوتا رہا۔

بیورغ نے اپنی محبوبہ سے وصل کے لیے اُس کے پہریداروں کو سونے کی اشرفیاں بطور رشوت دی تھیں۔اسی زمانے میں ایک اور جگہ بھی سکّے کا ذکر آیا ہے جب شہداد اپنی بیوی مہناز کو طلاق دیتا ہے تو کنکروں کے بجائے جیب سے تین اشرافیاں نکال کر بطور طلاق مہناز کی طرف پھینک دیتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس خودکفیل اور اجناس کے تبادلے والے معاشرے میں کسی طور کرنسی بھی داخل ہو چکی تھی۔یہ سکہ کیا تھا، کس کا تھا یہ تو معلوم نہیں۔مگر اِس کا بلوچ معاشرے میں (ثانوی طور پر ہی سہی) آجانا بذاتِ خود بڑی بات تھی۔ظاہر ہے وہ سونے یا چاندی کا سکہ ہی ہو گا جو بیرونی اقوام سے تجارت میں استعمال ہوتا ہوگا۔خود بلوچ کرنسی نے تو ڈیڑھ دوسو سال بعد میں دستیاب ہونا تھا۔شاید خوانینِ بلوچ سے قبل تاریخ دانوں کو بلوچ سکہ نہ ملا ہوگا۔خوانینِ قلات میں زر کا اچھا خاصا رواج ہوگیا۔اسی لیے تو تجارت کہیں سے کہیں پہنچ گئی تھی۔اب تو خیر سکّے بھی ضروری نہیں رہے۔لوگ محض اشارے استعمال کرنے لگے یعنی کاغذ (نوٹ یا چیک یا کارڈ) کا ایک ٹکڑا جس پر کہ ادا کرنے کا وعدہ درج ہوتا ہے، کافی سمجھا جانے لگا۔لیکن شاید یہ بھی میں پرانی دقیانوسی

بات کر رہا ہوں۔اب تو ای بنکنگ اور موبائل بنکنگ کا چلن شروع ہو چکا اور میری اس کتاب کے چھپ جانے تک معلوم نہیں پھر بٹ کوائن کے علاوہ کونسی نئی کرنسی چل پڑے گی۔

اسی طرح اس دور کا ایک کلاسیک شلی وحسن مولانغ کے نام سے ہے جس کی سٹوری اور شاعری نہایت دلکش اور دلگیر ہیں۔جو محض عشقیہ نہیں، تلخ ترین رزم کی رپورتاژ بھی ہے۔رشتوں کے گداز سے بھری اور فنی شاہکار داستان!

بلوچ کلاسیک میں دل ملّخ کا ذکر ہمیشہ پشیمانی، افسوس اور احساس زِیاں کے ساتھ آتا ہے۔وہ ایک مجسم بلوچ تھا، شکار وعشق وجنگ وشاعری کا دلدادہ۔وجاہت میں کوئی ثانی نہیں۔یہ لاجواب رند نوجوان جوئے بازی کی بری لت میں پڑ گیا۔اور آہستہ آہستہ بہت ہی دولت مند دل ملّخ، کنگال ہو جاتا ہے۔

شہداد ومہناز کی داستان والی مہناز، بلوچ تاریخ میں عورت کی طرف سے بے انصاف مردانہ سماج سے ٹکر لینے اور قبائلی نظام کی ناروائیوں سے مزاحمت کرنے کی علامت اور سمبل ہے۔ مردانہ سماج کے خلاف اس کی لازوال جدوجہد کو خوبصورت شاعری کے ذریعے امر کر دیا گیا۔

یہیں اِس دور میں ہمیں غلام داری سماج کی موجودگی کا بھی پتہ چلتا ہے۔اُن سے نہ صرف گھریلو کام کاج کروانا دستور تھا بلکہ انہیں ڈنڈوں چابکوں سے مارنے کا رواج بھی موجود تھا۔

یہ بہت ہی غور طلب اور دلچسپ بات ہے کہ بلوچ کلاسیکل شاعری میں جتنی بھی خواتین کا ذکر آیا ہے، مثبت انداز میں آیا ہے۔ہانی لے لیں، گوہر لے لیں، گراناز لے لیں، حتیٰ کہ شلی کو لے لیں، سب کی سب آپ کو مثبت کردار ادا کرتی نظر آتی ہیں۔یہ بہت ہی ممتاز بات ہے۔

دوستین وشیریں ایک بہت ہی حسین کلاسیک ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔شاعری بھی زبردست ہے۔

بالاچ (Balaach) کی داستان سولھویں صدی کی نہایت ہی دلکش داستان ہے۔ پنگھوڑے میں پڑے بالاچ کے سارے بھائی قتل ہو جاتے ہیں۔وہ بڑا ہو کر انتقام لیتا ہے۔اس سلسلے میں وہ گوریلا گیری شروع کرتا ہے اور دشمنوں کو ایک ایک کر کے قتل کرتا جاتا ہے۔اس طرح

بالاچ' 61 آدمی مار کر مر جاتا ہے۔اس کی قبر بگٹی قبیلے کے علاقے کے اندر سنگسیلا میں ہے۔اور اس کے بھائی دودا کی قبر ڈیرہ بگٹی شہر کے شمال مشرقی کنارے پر۔جنگی شاعری میں ملفوف یہ مکمل داستان اس سلسلے کی میری کتاب ''بلوچی زبان وادب'' میں موجود ہے۔

الغرض یہ پورا عہد ہلچل سے بھرا خوب صورت عہد تھا۔جو ابد تک بلوچ آسمان پر قطب کے ستارے کی مانند دمکتا رہے گا۔بلوچ کو صرف اُسی وقت تباہ کیا جاسکے گا جب پندرھویں سولھویں صدی کا اُس کا ادب اُس کی زندگی سے حذف کر دیا جائے۔

......مگر کیا یہ ممکن ہے؟!

ریفرنسز

1۔گشکوری،سردار خان۔''چاکرِ اعظم''۔1988ء۔ایم ایم ٹریڈرز کوئٹہ۔صفحہ 115

2۔خان،احمد یار خان۔''مختصر تاریخ بلوچ وخوانین بلوچ''۔1972ء۔ایوانِ بلوچ کراچی۔ صفحہ 34

3۔خان،احمد یار خان۔''مختصر تاریخ بلوچ وخوانین بلوچ''۔1972ء۔ایوانِ بلوچ کراچی۔ صفحہ 35

4۔آخوند،محمد صدیق۔''تاریخ ریاست کلات''۔1858ء۔پبلشر ندارد۔صفحہ 3

5۔ہتورام۔''تاریخ بلوچستان''۔آخری اشاعت 2018ء۔سید ہاشمی ریفرنس لائبریری۔ صفحہ 94

6۔احمد زئی،نصیر خان۔''تاریخ بلوچستان''،جلد چہارم' 1993ء۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔صفحہ 135

7۔احمد زئی،نصیر خان۔''تاریخ بلوچستان''،جلد چہارم' 1993ء۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔صفحہ 136

8۔خان،احمد یار خان۔''مختصر تاریخ بلوچ وخوانین بلوچ''۔1972ء۔ایوانِ بلوچ کراچی۔ صفحہ 36

9۔گشکوری،سردار خان۔''چاکرِ اعظم''۔صفحہ 126

10۔مولائی شیدائی۔''سرزمینِ بلوچ''۔صفحہ 295

11۔کوئہلو پاؤلو۔''دی ففتھ ماؤنٹین''۔1998ء۔ہارپر کولنز پبلشرز نیویارک۔صفحہ 64

12۔ملک،فدا حسین۔''بلوچستان،اے کنفلکٹ آف ٹیر ٹیوز 2020''۔لائٹ سٹون پبلشرز۔ صفحہ 3

رندولاشار خانہ جنگی

یہیں پہ چاکر و گہرام کی خون آشام جنگیں شروع ہوئیں ۔افغان محقق ابراہیم عطائی صاحب کی تحقیق کے مطابق اُن کے درمیان کل 25 لڑائیاں ہوئیں جن میں دس بار لاشاری کو اور پندرہ بار رندوں کو فتح ہوئی ۔(1)......(مگر بھائیوں میں فتح کیا ہونا تھا، دونوں بر باد ہو گئے)۔

اس طویل و تباہ کن جنگ کی بڑی وجوہات درج ذیل ہیں:

1۔ لاشار اور رند قبائل کے درمیان سبی اور گنداواہ کی قابل کاشت اور زرخیز زمینوں کی تقسیم پر باہمی کشمکش اور ہنگامہ خیزی نے اختلافات کی صورت اختیار کر لی۔

2- ایک اور بڑی وجہ چراگاہوں والے علاقوں کی کمی تھی۔

3- ایک فروعی بات گوہر جتنی کی بھی کی جاتی ہے۔

4- بلوچستان کی دو ہمسایہ طاقتوں، یعنی قندھار کے ارغون اور سندھ کے سمہ کی طرف سے حریصانہ مداخلت۔ واضح رہے کہ 1470ء میں ترک وارلارڈ سلطان حسین مرزا نے کوئٹہ، پشین اور سیوی کو ترکمن امیر شجاع الدین ذنوں (ارغون) کے لیے قبضہ کر لیا۔

چنانچہ تباہ کن کوتاہ بینی نے چاکر کو مجبور کیا اور اس نے لاشاری کو زیر کرنے کے لیے ہرات کے اسی سلطان حسین سے مدد کی درخواست کر ڈالی۔

اس سلطان حسین نے اُس کی درخواست منظور کر لی ۔اُس نے آکر پہلے تو لاشاریوں کا قتلِ عام کیا، اُن کی فوجی قوت ختم کر دی اور کچھی کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔اُس نے بلوچ مشترکہ قوت کو توڑنے کے فوراً بعد ’’چراغ سب کے بجھیں گے، ہوا کسی کی نہیں‘‘ کے مصداق رندوں کی خبر لی۔ سیوی پر قبضہ کر کے رندوں کے اقتدار کو بھی ختم کر ڈالا۔ یوں ترکمن وارلارڈ سلطان حسین نے 1470ء میں بلوچستان پر قبضہ کر لیا۔ چاکر تباہ، گوہرام تباہ۔ وطن چھن گیا اور پوری قوم در بدر ہو گئی۔ بلوچ شاعروں نے وطن بدر ہونے کی کیفیات اس قدر دل ہلا دینے والے انداز میں بیان کی ہیں کہ ان کے سامنے بڑے سے بڑے عالمی مرثیے بھی ہیچ ہیں۔

سلطان حسین نے 1480ء میں قندھار، شال، پشنگ، سیوی اور مستنگ وغیرہ کے علاقوں پر شجاع الدین ذوالنوں بیگ ارغون کو گورنر مقرر کیا۔

اُدھر سمہ حکمرانی کا عروج نظام الدین کے عہد میں تھا جسے عرف عام میں ’’جام نندہ‘‘ کہتے ہیں جو 1461ء میں حاکم بن کر 48 برس تک حکومت کرتا رہا۔اس کی حکمرانی کے آخر میں ارغون (ترک) سندھ میں نمودار ہوئے اور ارغون چیف ذوالنوں بیگ نے پشین اور مستنگ فتح کر لیے۔ ازبکوں سے لڑائی میں ذوالنوں بیگ کے قتل ہو جانے کے بعد اس کا بیٹا شاہ بیگ ارغون اس علاقے کا حکمران بنا۔

ایک اور ترک، بابر کے مقابلے میں قندہار کو بچانا مشکل ہو گیا اور وہ 1511ء میں سیوی پر قبضہ کرنے روانہ ہو گیا۔ تین ہزار بلوچوں نے مقابلہ کیا۔مگر شاہ بیگ کی فوج کو مکمل طور پر فتح ہو گئی۔ وہ مرزا عیسیٰ خان ترخان کو گورنر بنا کر قندہار واپس لوٹا۔ شاہ بیگ نے 1517ء میں جھالاوان پر بھی قبضہ کر لیا۔(2) مگر 1512ء میں بابر نے بڑی فوج کے ساتھ قندہار پر قبضہ کر لیا۔ 1518ء میں شاہ بیگ نے سلطان علی ارغون اور ذبیک ترخان کو سیوی اور گنداواہ کے قلعوں کی حفاظت کے لیے چھوڑا اور 1520ء تک سمہ حکمرانوں کا مکمل صفایا کر کے سندھ پر قابض ہو گیا۔(3)

شاہ بیگ 1522ء میں مر گیا اور اس کا بیٹا شاہ حسین 1554ء تک بادشاہی کے مزے لوٹتا رہا۔ اس کی موت کے ساتھ ہی ارغون کی خانی کا خاتمہ ہو گیا اور اس کا علاقہ ٹھٹھہ کے گورنر مرزا

عیسیٰ خان ترخان اور بکھر کے سلطان محمد کے مابین تقسیم ہوگیا۔

بابر کے اس علاقے کے سیاسی میدان میں آتے ہی ارغونوں نے اُس کی اطاعت قبول کر لی اور یوں یہ علاقہ مغل ترکمنوں کے قبضے میں آ گیا۔

اِدھر چاکر اس تیس سالہ جنگ اور لاشاریوں کو تباہ کرنے کے بعد خود بھی نڈھال و کمزور و بے وقعت ہو کر علاقہ بدر ہو گیا۔ وہ 1512ء کے آغاز میں سبی سے براستہ موجودہ ماوند ملتان چلا گیا۔ اس راستے میں چاکرہ کئور، چاکرہ ہوڈ، چاکرہ میہاگ' اور چاکرہ پوش نامی جگہیں اس کے سفر کے سنگ میل کے بطور آج بھی قائم دائم ہیں۔ اسی طرح اُس کا پیچھا کرنے والے تُرکوں کی نشانی کے بطور علاقے اب بھی موجود ہیں: تُرک ءَ کنڈ، تُرک ءَ کچ۔

بلوچستان میں سے گوہرام لاشاری تو پہلے ہی تباہ اور گم ہو گیا اور گجرات کاٹھیاواڑ کی جانب چلا گیا۔

ریفرنسز

1۔ عطائی، محمد ابراہیم۔ ''د بلوچ ملی آزادی بخشونکو جنبشونو تہ یوہ کتنہ''۔ اکیڈمی آف سائنسز، کابل۔ صفحہ 14

2۔ جھالاوان گزیٹیئر۔ صفحہ 37

3۔ گزیٹیئر۔ کوئٹہ پشین۔ صفحہ 33

وطن بدر چاکر

چاکر نے ہند جانے کے لیے ظاہر ہے کہ سبی سے موجودہ مری قبیلے کے علاقے کو اپنی وطن بدری کا راہ گزر بنا لیا۔ راستے میں بجار اور اس کا گروہ ''بجار وڈھ'' نامی مقام پہ چاکر سے جدا ہو گیا تھا۔ بجار کے بنا، چاکر اب باقی ماندہ لوگوں کے ساتھ کاہان کے قریب بار بوژ نامی درے سے ہوتا ہوا موجودہ پنجاب کی جانب نکل گیا۔ (1)

اُس کے زمانے میں مری کے علاقے میں آبادی بہت کم تھی۔ ماوند، کاہان اور بابر کچھ کے ارد گرد ہی آبادی تھی۔ روایتوں کے مطابق چاکر کے اسی سفر کے دوران ہی اس آبادی کا' نام مری پڑ گیا۔ بجار کی سربراہی میں رند کے گھرانے دریائے لہڑی کے کنارے سے لے کر ماوند کی وسعتوں میں آباد ہو گئے۔ (2)

اُدھر چاکر بلوچستان سے وطن بدر ہونے کے بعد کئی قبائل کے ساتھ ملتان کے صوبے میں آباد ہو گیا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہاں پہلے بلوچ آباد نہ تھے۔ تاریخ ہمیں یہاں ملتان کے علاقوں میں حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی بلوچوں کی موجودگی کا پتہ دیتی ہے۔

چاکر کے آنے سے ملتان کے لنگاہ حکمرانوں کو ایک ''ریڈی میڈ'' لڑاکا فورس مل گئی۔ انھوں نے اپنے اغراض کی خاطر چاکر کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں۔ یہ تھا سلطان شاہ محمود ابنِ سلطان فیروز شاہ ابنِ سلطان حسین لنگاہ۔ (3)

دوسرے لفظوں میں بلوچستان کا سابقہ فیوڈل حکمران چاکر ایک بار تو مہاجر چاکر بنا۔ مگر

اس کے بعد پھر ایک مستحکم فیوڈل بنا۔ پہلے اُس کے پاس سیوی کی پانی والی زمین تھی ،اب ملتان کی زرخیز زمین ۔دوسرے لفظوں میں قبیلہ کی افرادی قوت سردار کے لیے بذاتِ خود کرنسی کا کام دیتا تھا۔یہ اُس کے ہاتھ ایک ٹریولنگ چیک تھا جسے جب چاہتا کیش کرالیتا۔

یہ لنگاہ لوگ خود نویں صدی میں موجودہ بلوچستان کے سیوی علاقہ میں تھے ۔جب بلوچوں نے انھیں دھکیلا تو وہ سندھ کی جانب بڑھے ۔لنگاہ سردار رائے سہارا نے شیخ یوسف سے جو ملتان میں حکومت کرتا تھا ،اپنی لڑکی کی شادی کر کے دوستی کر لی اور بعد ازاں ملتان پر قبضہ کر لیا۔ رائے سہارا نے ''قطب الدین'' کا لقب اختیار کیا ۔اور پانچ سال (1550-1554) تک ملتان میں حکومت کی ۔ملتان کے قرب و جوار میں بلوچوں کا تسلط تھا۔ چنانچہ قطب الدین سلطان کے وارث سلطان حسین کو کئی مرتبہ اُن سے لڑنا پڑا۔اُس نے راوی کے کنارے شمال پر واقع شورکوٹ پر حملہ کیا جو غازی خان بلوچ کی حکومت میں تھا ۔بلوچ شورکوٹ کے شمال میں اور شمال مغرب میں بھیرا،خوشاب اور موجود جھنگ ضلع میں چنیوٹ تک علاقے میں آباد تھے۔

سلطان حسین لنگاہ نے اپنی جارحانہ کارروائی جاری رکھی اور دھن کوٹ سے کوٹ کہروڑ تک کے تمام علاقے پر قبضہ کرلیا۔ بہلول لودھی نے اپنے لڑکے بایزید اور اپنے سپہ سالار تاتارخان کو ملتان فتح کرنے کے لیے بھیجا۔افغانوں سے خوف زدہ ہو کر لنگاہ سرداروں نے نو وارد بلوچ قبیلوں سے مدد مانگی ۔یہ وہ وقت تھا جب گنداواہ اور مکران سے ملک سہراب دودائی اور اس کے دونوں لڑکے اسمٰعیل اور فتح خان مع اپنے تمام قبیلے اور عیال واطفال کے دریائے سندھ کو عبور کر کے شمال کی جانب بھٹکتے ہوئے پہنچے تھے۔سلطان حسین لنگاہ نے ملک سہراب اور اس کے بیٹوں کو دھن کوٹ سے کہروڑ تک کا علاقہ جاگیر دے دیا۔(4)

سلطان حسین لنگاہ کی حکومت 1460ء سے صدی کے آخر تک رہی۔سلطان حسین لنگاہ کے بعد 26 سال کے عرصہ میں دو حکمران ہوئے ؛فیروز شاہ اور محمود۔محمود کے زمانے میں شورش زیادہ تھی۔ جام بایزید نے ملتان پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر (سلطان) محمود نے اسے شکست دے دی جس کے بعد جام بایزید دریائے راوی پہ واقع شورکوٹ کے قلعے چلا گیا۔اور وہاں سلطان سکندر

لودھی کے نام کا خطبہ پڑھنے لگا۔اس نے لنگاہ سلطان محمود کے خلاف سکندر لودھی سے مدد کی اپیل کی۔جب سلطان محمود لنگاہ نے شورکوٹ پر حملہ کیا تو سکندر لودھی نے پنجاب کے گورنر دولت خان لودھی کو جام بایزید کی مدد کرنے کا حکم دے دیا۔دولت خان نے سلطان محمود لنگاہ کو مجبور کر دیا کہ وہ شورکوٹ کا قلعہ دہلی کے سلطان کے حوالے کر دے اور دریائے راوی کے نیچے کے حصہ کو دونوں سلطانوں کے درمیان سرحد مان لے۔چونکہ لنگاہ ریاست میں دودائی بلوچ بہت زیادہ طاقت رکھتے اس لیے جام بایزید نے ان کے جدی پشتی دشمنوں یعنی رند بلوچوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ اپنے سردار چاکر رند کی رہنمائی میں اپنے قبیلے کے ساتھ ملتان ہجرت کر جائیں ۔چنانچہ میر چاکر اپنے دولڑکوں یعنی اللہ داد اور شاہ داد کے ساتھ سیوی کی جانب سے ملتان آ گیا۔(5)

یوں چاکر کا متحرک عہد برادر کشی کے ہاتھوں سبی میں ختم ہوا۔اور پھر ایک آدھ ڈُبکی کے بعد تاریخ میں گم نامی اُس کا مقدر بنی۔

ریفرنسز

1۔گشکوری،سردار خان۔''چاکرِاعظم''۔1988ء۔صفحہ 139
2۔مری،خدا بخش۔''دی بلوچیز تھرو سنچریز''۔1964ء۔اسلامیہ پریس کوئٹہ۔صفحہ نمبر 129
3۔احمد،خواجہ نظام الدین۔''طبقاتِ اکبری''۔جلد سوم۔صفحہ 521
4۔قانون گو،کالکا رجن۔''شیر شاہ سوری اور اس کا عہد''۔1996ء۔تخلیقات لاہور۔صفحہ 464
5۔ایضاً۔صفحہ 466

بلوچ اور مغل

(مغل سلطنت 1526ء تا 1857ء)

ظہیر الدین بابرؔ تیمور لنگ اور چنانچہ چنگیز خان کی اولاد میں سے تھا۔اُسے سمرقند میں ایک صوبہ ورثے میں ملا تھا۔مگر اس کے بھائی نے اس کا تختہ الٹ کر اُسے وہاں سے بھگا دیا۔اس وسطِ ایشیائی کم سن مفرور اور بھگوڑے وار لارڈ نے 1504ء میں کابل فتح کرلیا۔پھر اس نے اسے اپنا مضبوط مرکز بنالیا اور وہاں سے وہ آس پاس فتوحات کرنے کی تدبیریں کرنے لگا۔اس کی مستقل نگاہ،غنیمت کے حتمی مال کے ہیڈکوارٹر یعنی دہلی پر تھی۔

سمرقند پر دوبارہ قبضہ کی کئی ناکام کوششوں کے بعد بابر نے اپنی مکمل توجہ جنوب کی طرف کردی اور پانچویں کوشش پہ ابراہیم لودھی کی فوج کو پانی پت کے میدان میں شکست دے دی۔اس طرح ابراہیم ہندوستان میں لودھی سلسلے کا آخری،اور بابر،مغلیہ سلسلے کا پہلا حکمران بنا۔

دراصل جب وہ ابھی کابل میں تھا تو پنجاب کے صوبیدار دولت خان لودھی کی جانب سے ایک وفد نے اُس سے ملاقات کرکے اُسے پنجاب آنے کی دعوت دی۔جب دہلی کے بادشاہ کو دولت خان کی وفاداری پر شک ہوا تو اس نے اُسے لاہور سے نکال دیا۔اور وہ سابق حاکمِ لاہور بلوچوں کے پاس پناہ لینے پر مجبور ہوا۔بابر پنجاب روانہ ہوا تو دیپالپور کے مقام پر دولت خان جو بلوچوں کی پناہ میں تھا،بابر کے ساتھ مل گیا۔(1)

ظاہر ہے کہ ہر حملہ آور بادشاہ کی طرح بابر کی بھی بہت سی خواہشات تھیں اور بہت سے

ایجنڈے تھے۔اور اِن ساری خواہشات کی تکمیل وہ ہندوستان فتح کرنے کے بعد کرسکتا تھا۔مگر کہیں سے منڈلاتی موت نے آ کر اُسے ہمیشہ کے لیے فطرت کی بیکراں ہستی میں جذب کرلیا۔اور اُس کی خالی کردہ چوکی پر ہمایوں ''ظلِ سبحانی'' بن گیا۔اسی دربار کے بطن سے شیر شاہ نامی ایک اور وار لارڈ ابھرا،اور اُس نے ہمایوں کی دوڑ لگوادی۔چنانچہ ایک اور ظل الٰہی وجود میں آیا،ایک اور بادشاہ بنا،اور استحصال کی ایک اور شکل سامنے آئی۔

ملتان کے پورے صوبے میں بلوچ آباد تھے۔اور بہت قدیم زمانے سے آباد تھے۔یہ جو مفروضہ گھڑا ہوا ہے کہ بلوچ بابر و ہمایوں کے زمانے میں پنجاب گئے تھے،مکمل سچ نہیں ہے۔پتہ نہیں یہ مائیگریشن تھیوری کون ایجاد کرتا رہا ہے۔

1541ء میں شیر شاہ نے دیکھا کہ بھیرا اور خوشاب میں دودائی بلوچ آباد ہیں اور یہی بلوچ یہاں کے حکمران ہیں۔وہ بلوچوں کے معاملے میں دست اندازی پسند نہیں کرتا تھا۔کیوں کہ اگر وہ لوگ اس کے مخالف ہوگئے تو وہ کسی کو بھی پانچ ہزار گھڑسواروں کی فوج بہ آسانی فراہم کرسکتے تھے۔

شیر شاہ نے خوشاب کے علاقے میں بلوچ سردار فتح خان دودائی، اسماعیل خان اور غازی خان کی جاگیریں بحال رکھیں۔ وجہ یہ تھی کہ وہ باجور سے لے کر بھیرا تک کا پہاڑی علاقہ اسماعیل خان بلوچ کی امداد کے بغیر اپنے تسلط میں نہیں رکھ سکتا تھا۔لہٰذا اُس نے اسماعیل خان کی فوج کو اپنی فہرستِ سپاہیان میں شامل کرلیا...... پوری پندرہویں صدی میں بلوچوں کے دودائی اور ہوت قبائل بولان کے دہانے سے لے کر گومل کے درے تک اس تمام علاقہ پر قابض تھے جو کوہِ سلیمان کے سلسلے کے جنوب میں تھا۔بلوچوں کا رند قبیلہ چناب،راوی اور ستلج کے میدانوں میں تھا۔
(2)

بلوچوں کے بارے میں شیر شاہ کی پالیسی کا دوسرا دور 1543ء سے شروع ہوتا ہے جب ہیبت خان نیازی کی کمان میں فتح و توسیع کی کیفیت رہی۔1541ء میں شیر شاہ اس حالت میں نہیں تھا کہ بلوچوں کے ساتھ سختی کرسکتا۔وہ اگر اس موقع پر بلوچوں پر سختی کرکے ان کی جاگیریں ضبط کر

لیتا اور وہاں دست اندازی کرتا تو ممکن تھا کہ تمام بلوچ متحد ہو کر اس کے خلاف محاذ بنا لیتے۔۔۔۔ شیر شاہ نے لومڑی والے انداز میں بات کو سلجھایا۔ اُس نے لنگاہوں کو جن کا علاقہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا یہ امید دلائی کہ وہ ارغونوں سے انتقام لینے میں ان کی مدد کرے گا۔ شیر شاہ نے غازی خان اور اسمٰعیل خان بلوچوں کا اپنے اپنے علاقہ پر قبضہ تسلیم کر لیا۔ اس نے فتح خان دودائی کو ملتان میں اپنا فوج دار مقرر کر دیا۔ اسی طرح دوسری کئی رعایتیں بھی بلوچ سرداروں کو دیں۔(3)

لیکن بعد میں شیر شاہ نے اپنی پالیسی بدل لی۔ اس نے ملتان کے بلوچوں پر حملہ کرنے کے لیے 1543ء کا سال چنا۔ شیر شاہ کے حکم سے ہیبت خان نیازی نے فوج کشی کی۔

اس سے قبل 1539ء میں شیر شاہ کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ہمایوں بھاگ کر لاہور چلا گیا اور وہاں سے ملتان جا کر دم لیا۔ جب وہ اوکاڑہ کے قریب قصبہ سرگودھا پہنچا تو اس کی خوراک کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ اور اس نے وہاں ایک فیوڈل، بخشو بلوچ سے مدد طلب کی۔ بخشو نے آٹے سے بھری ہوئی 100 کشتیاں شکست خوردہ بادشاہ کو امداد کے بطور فراہم کیں۔ بعد ازاں انھی کشتیوں پر سوار ہو کر بادشاہ نے دریا عبور کیا۔ ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم، بخشو کی اس امداد و کمک کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتی ہے: ''اللہ تعالیٰ اپنا رحم و کرم بخشو پر نازل کرے جس نے سخت مشکل کی گھڑی میں شہنشاہ کی خدمت کی۔''(4)

ہمایوں وہاں سے پناہ گزیں کے بطور ڈیرہ غازی خان آ کر بلوچوں کی سجی اور کاک سے لطف اندوز ہوا۔ تنزلی کے اُس سفر میں اس نے اپنے دو چار شناساؤں کے دروازے ضرور کھٹکھٹائے مگر جب انسان کی آنکھیں بدل جاتی ہیں تو اس کی روایتیں اور ثقافتی اقدار بھی بدل جاتی ہیں۔ بالآخر شال و مستنگ کے بلوچوں (سردار لونگ خان) نے اُسے باہوٹ بنا لیا۔ یہ واقعہ 1545ء کا ہے۔ بلوچستان سے گزرتے ہوئے وہ نوشکی میں رکا جہاں سردار ملک خطی نے اس کی مدد کی۔ جسے ابوالفضل نے ''صحرا کے رہزنوں کے سرخیل'' کا نام دیا تھا۔ (ایسے فضول لوگ ہیں۔ اپنے وطن میں موجود زندگانی گزارنے والے کو، اور اِن بھگوڑوں کی امداد کرنے والوں کو کتنا کھردرا نام دیتے ہیں یہ لوگ۔ یہ سارے حملہ آور اتنے احسان فراموش کیوں ہوتے ہیں!)۔ وہاں سے بلوچوں نے اُس

پناہ گیر کو گرم سیل کے راستے سیستان ایران تک پہنچایا۔ وہاں ایران کی مدد سے اس نے قندھار فتح کر لیا اور آگے کی فتوحات کے لیے پھر بلوچوں سے مدد کی اپیل کی۔ بلوچ جوق در جوق موجودہ مری علاقے سے روانہ ہوئے اور ڈیرہ غازی خان میں خود کو منظّم کرنے لگے۔ لاہور کے مقام پر بلوچ لشکر اُس سے آن ملا۔ 1555ء میں سرہند کے میدان میں میر چاکر کی ہمشیرہ بانڑی کے اکسانے اور جوش دلانے کی ٹیکٹک نے بلوچوں کو فیصلہ کن جنگ پر ابھارا۔ اور اُن کی بہادری اور بے لوث جنگ کے نتیجے میں اُن کے اتحادی ہمایوں کو تخت نصیب ہوا۔(5)

بلوچ سرداروں میں شہزاد، نوہک اور النڑ چاکر خان کے ساتھ تھے۔ رندوں کے تین سو جوان مارے گئے مگر بلیدی بہت قتل ہوئے۔ ہمایوں نے کچھ بلوچوں کو پنجاب کے علاقہ دوآبہ میں جاگیریں دیں اور ٹالپروں کو کوہِ سلیمان کے دامن میں۔ (یہ ٹالپر بعد میں وہاں نہ ٹکے اور سندھ میں جا بسے اور حکومت قائم کی)۔

اس طرح ہزار گنج والے دلی پر ہمایوں اور اس کے اتحادیوں نے قبضہ کر لیا۔ ''دہلی کی فتح کے بعد رندوں کے ہزاروں خاندان دارالسلطنت کے مضافات میں آباد ہو گئے۔ بعد ازاں ان میں سے کئی آگرہ کی جانب منتقل ہو گئے اور ''بلوچ پورہ'' بسایا''۔(6)۔ ہمایوں نے شال اور مستنگ لونگ خان بلوچ کو دے دیے۔(7)

ہمایوں کے بعد اکبر کی حکمرانی پورے شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان کے نصف (شمالی) حصے پر تھی۔ پنجاب کے بلوچوں نے 1586ء میں اس کی حکمرانی مانی۔(8) اکبر نے بلوچستان کے تین شہروں، شال، مستنج، اور قلات انجیرہ پر خراج عائد کیا جس کی تفصیلات آئینِ اکبری میں یوں بیان کی گئی ہیں:

اسمائے محال	تومان	دینار	گوسفند، اسپ	خروار غلہ	سوار	پیادہ
قلات نجیرہ	......	......	اسپ 36، اشتر 36	......	500	500
مستنج یا مستنگ	10	8000	......	470	100	500
شال	41/2	......	940 گوسفند	780	100	100

آ ئین اکبری کے مطابق سبی اکبر بادشاہ کے تحت ملتان صوبے میں بکھر کی سرکار کا ایک ضلع تھا اور یہاں کے عوام اس قبضہ گر بادشاہ کو 13 لاکھ 81 ہزار 9 سو 30 دام (dam) دیتے تھے۔ یہاں سے وہ 500 گھڑسوار اور 1500 پیادہ فوج لیتا تھا۔ کچھی کا علاقہ بھی اسی میں شامل تھا۔ فتح پور اور گاجان اِس مغل سامراج کو بالترتیب 4 لاکھ 70 ہزار 8 سو 59 اور 6 لاکھ 45 ہزار 2 سو 5 دام دیتے تھے۔ اور ہر ایک 200 گھڑسوار اور 1000 پیادہ دیا کرتے تھے۔(9)

شاہ جہاں کے زمانے میں بلوچوں نے جگہ جگہ شورشیں شروع کیں۔ اس بدامنی نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ صوبہ ملتان کے انتظامی معاملات کی نگرانی اپنے بیٹے ''شہزادہ'' اورنگ زیب کے سپرد کر دے۔ 1106 ہجری میں اورنگ زیب نے بلوچوں پر حملہ کر دیا۔ (شہزادہ کس بات کا؟ از خود شاہزادہ، سردارزادہ، نواب زادہ!! ۔ فرغانہ کے اُکھڑے لٹیرے یہاں شاہ و شہزادے بن بیٹھے)۔

مغل دورِ حکومت تک ہمارے ہاں کی وسیع وعریض زمین کی کوئی خاص اہمیت نہ ہوتی تھی۔ کسان کی ملکیت کے بطور تخم اور بیل اہمیت رکھتے تھے۔ قبیلہ اور برادری کی چوکھاٹ میں کسانوں کا معاشرہ قائم تھا۔ کسان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دستکار موجود تھے۔ کسان انھیں جنس کی صورت میں معاوضہ دیا کرتے تھے۔

مغلوں نے ہمارے معاشرے میں جاگیرداروں کا ایک مضبوط طبقہ پیدا کیا۔ ہمارا یہ اوپری طبقہ مغل کی مرکزی ریاست کی خدمت میں لگ گیا۔ مغل عہد میں بلوچستان کے اندر تاجر طبقہ بھی بھرپور انداز میں موجود تھا۔ بابر کی خودنوشت میں لکھا ہے کہ جب بابر کا امیر مہدی کوکلتاش درہ بولان کے راستے سندھ اور وہاں سے ہوکر ملتان جا رہا تھا تو شالکوٹ کے مقام پر اس کے کارندوں نے دکانداروں سے معاوضہ دیے بغیر راشن لینے کی کوشش کی جس پر بلوچوں نے ہنگامہ برپا کر دیا اور معاہدے کے بعد ہی مغل اور بلوچ تاجروں کے تعلقات بہتر ہو گئے۔

جاگیرداری کو مضبوط کرنا دراصل ہمارے پسماندہ معاشرے کو ارتقا دینا تھا۔ چنانچہ اب یہاں زبردست معاشی ترقی ہوئی۔ کھیتی باڑی کو فروغ حاصل ہوا۔ دستکاریاں فروغ پا گئیں اور

جاگیرداری نظام مضبوط تر ہوتا گیا۔ گو کہ غلام داری موجود تھی مگر یہ زیادہ تر گھریلو غلام تھے۔ اگر ایک طرف سکھ مذہب کا ابھار تھا اور کسانوں کی مہدوی تحریک کا فروغ تھا تو ہمارے خطے میں روشان تحریک بھی موجود تھی۔ روشان تحریک کے حامیوں نے بادشاہ اکبر اور جاگیردار طبقے کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اس تحریک کا بانی بایزید روشان تھا۔ یہ تحریک مغل کو بھی نکال باہر کرنا چاہتی تھی اور فیوڈلزم کو بھی ختم کرنا چاہتی تھی۔ زبردست لڑائیاں ہوئیں۔ مغل اور فیوڈلوں کو زبردست شکستیں ہوئیں۔ اس زبردست کسان تحریک کو کہیں جا کر سترھویں صدی میں ختم کیا جاسکا۔

فوجی خدمت کے عوض جاگیر عطا کرنے کا جو نظام بلوچوں میں مغلوں نے رائج کیا تھا، اس سے ہمارے طاقت ور باج گزار سردار، داخلی طور پر مزید طاقت ور ہو گئے۔ یہ مقامی حاکموں کی حیثیت رکھتے تھے، مگر تھے مغل کے ملازم۔ انھوں نے ہی آگے جا کر خودمختار حکمران بننا تھا، اور پھر انہی کی آل اولاد نے جاگیرداری سے ترقی کر کے بورژوا سماج میں داخل ہونا تھا۔

مگر سچی بات یہ کہ جاگیرداری نظام ہی موجود رہا اور یہی نظام طاقتور ہوتا گیا۔ اس کے لیے بلوچستان میں دو بڑی وجوہات بنیں۔ ایک تو ہمارا کم بخت خودکفیل دیہی معاشرہ آگے نہ جاتا تھا، اور دوسرا یہ کہ جب بھی ہماری یہ خودکفالت ذرا سی آگے کو حرکت کرتی تو پھر کسی غیرملکی حملہ آور کا ڈنڈا ہم پہ پڑ جاتا۔ ہماری معاشی اور طبقاتی ترقی دوبارہ معکوس ہو جاتی۔ ہم حسبِ سابق جاگیرداری کے مندر کے گرد ہی طواف کرتے رہے۔

ہم اس دور کے بارے میں بس دو تین فقرے اور لکھیں گے۔

اس زمانے میں نچلا طبقہ تین مختلف حصوں پر مشتمل تھا:

(1) کسان (2) تاجر، دستکار اور موسیقار (3) غلام۔

ساری مشقتی خدمات غلاموں کو بجالانا تھیں۔ تاجروں، دستکاروں اور موسیقاروں کے پیشے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ان پیشوں سے وابستہ لوگ ہندو، لوہار اور ڈومب ہوا کرتے تھے جو غلاموں کے برعکس آزاد تھے۔(10)

باغارسر

بلوچ کلاسیک میں یہ کلمتی قبیلہ ایک اور قبیلے سے لڑ پڑتا ہے جسے ہماری شاعری میں ''بلمتی'' کہا گیا ہے۔گمان یہ ہے کہ یہ ''بلفتی'' ہوں گے۔ یہ لوگ بھی اب مری بگٹی میں نہیں ہیں بلکہ لسبیلہ میں رہائش پذیر ہیں۔ کلمتی اور بلمتی ''باغار'' نامی رینگنے والے جانور کے اوپر آپس میں لڑے۔مگر وہ ماوند میں لڑے،مکران میں نہیں۔اس لیے کہ ایک پورا علاقہ اُن کی جائے رہائش اور پھر''باغار'' کے اوپر لڑائی کی وجہ سے''باغارسر'' کے نام سے آج بھی موجود ہے، ماوند میں۔مگر یہ دونوں قبیلے مشرقی بلوچستان سے گم ہو چکے ہیں۔سردار خان گشکوری کے حساب کتاب میں یہ لڑائی چاکر کی بلوچستان سے روانگی سے تقریباً40 برس بعد سندھ کے ارغون حکمران شاہ حسین ولد شاہ بیگ کے دور میں لڑی گئی۔(11) اس لڑائی میں سو افراد مارے گئے۔ دونوں تھک گئے، وطن چھوڑ دیا۔ اٹھارویں صدی کے ایک گم نام شاعر نے اس قصہ کو سلیمانی لہجے کی شاعری میں بیان کیا تھا۔

موجودہ مری بگٹی علاقے میں ایک زمانے میں گورگیژ، کلمتی اور بلیدی رہتے تھے۔کلمتی اب مغربی بلوچستان میں رہتے ہیں۔اُن بستیوں کے نشان اور''باغار'' کے گام گیژ کے بارے میں یا تو لوگ سینہ بہ سینہ والی باتیں دہراتے ہیں یا پھر ماوند کے قریب''باغارسر'' نامی جگہ پر ان کی نشانیاں اور آثار اُن کی ہستی کا ثبوت دیتی ہیں۔ یہ گام گیژ اور آثار ابھی دس بارہ برس قبل تک موجود تھے اور راقم کے قصبہ ماوند سے ایک میل مغرب میں ہماری چہل قدمیوں کی منزل تھے۔ہم تصور میں اس جنگ میں کئی بار کود پڑے تھے۔لیکن اب تو وہ آثار بھی پچھلے برسوں زراعت والے بلڈوزر نے ملیا میٹ کر دیے ہیں۔(اس پاپی پیٹ کو اللہ ہی معاف کرسکتا ہے،غفار اور رحیم جو ہے)۔

(مزید تفصیل کے لیے دیکھیے مصنف کی کتاب،''بلوچی زبان وادب'')

ریفرنسز

1۔لطیف۔''تاریخ پنجاب''۔صفحہ نمبر273

2۔قانون گو، کالکارنجن۔''شیر شاہ سوری اور اس کا عہد''۔1996ء۔تخلیقات لاہور۔صفحہ 459

3۔ قانون گو۔صفحہ نمبر469۔

4۔گلبدن بیگم / پروفیسر سید حسن۔''ہمایوں نامہ''۔صفحہ نمبر56

5۔ ڈیمز، لانگ ورتھ۔''پاپولر پوئٹری آف بلوچیز''۔صفحہ نمبر33

6۔گشکوری۔''چاکرِ اعظم۔''صفحہ نمبر183

7۔گزیٹیئر، کوئٹہ پشین۔1986ء۔گوشۂ ادب کوئٹہ۔صفحہ نمبر33

8۔ پال ٹائیٹس۔ Pakistan Balochistan, December 1991 Tribalism, Ethinicity, and the state in۔صفحہ نمبر60

9۔کچھی گزیٹیئر۔صفحہ نمبر136

10۔شلز، فریڈ۔''نومیڈازم اینڈ کالونیلزم۔''آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔2002ء۔صفحہ 59

11۔ بلوچ، سردار خان۔''لٹریری ہسٹری آف دی بلوچ''۔1977۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔جلد نمبر1۔ صفحہ 401

فیوڈل ازم کا فروغ

بلوچ ریاست کی باقاعدہ تشکیل

پندرہویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی تک بلوچ سماج کا بڑا حصہ ایک ایسی تبدیلی سے گزرا جس میں کہ زرعی زمین کا بڑا حصہ اب مشترکہ قبائلی ملکیت نہ رہا۔ اب زمین شخصی ملکیت میں ڈھلنے گئی تھی۔ عام قبیلے کے افراد میں بھی۔ مگر زیادہ تر زورآور، چست اور چالاک لوگوں کی ملکیت میں۔ یہ لوگ زیادہ تر قبیلوں کے حاکم ہوا کرتے تھے۔ قبیلوں کے یہ حاکم استادی اور مکر سے اب قبیلے کی حاکمی کے ساتھ ساتھ زمین زیادہ سے زیادہ سمیٹتے ہوئے فیوڈل لارڈز میں بھی ڈھلنے لگے تھے۔

بلوچ قبیلوں کی جانب سے زمین پر آباد ہو جانے کا یہ عمل سولہویں صدی کے آخر تک مکمل ہوا اور زرعی معیشت کی بالادستی متشکل ہونے لگی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خانہ بدوشی یا سرقبیلوی نظام مشینی انداز میں یکدم، یامکمل طور پر ختم ہوا۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ زمین پر آباد ہونے والوں میں بھی، اور مالداری میں مشغول بلوچوں میں بھی، بہت عرصہ تک (اور کچھ حالتوں میں آج تک) خانہ بدوشی جاری تھی۔

قلات میں تیرہویں صدی کے وسط تک مغلوں کے نائب' ڈھیلی ڈھالی حکومت چلاتے رہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ عام قبائل کسی مُغل شُغل کو نہیں جانتے تھے۔ وہ اپنے اپنے علاقوں میں آزادانہ زندگی گزار رہے تھے۔ 1666ء میں میرواڑی قبیلے کے فیوڈل ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور مغل نائبوں کے گیریزن تباہ کر کے قلات پر قابض ہو گئے۔ اس قبیلے کے میر احمد نے

اقتدار سنبھال لیا اور یہاں احمد زئیوں کی حکومت قائم کی۔

بلوچستان میں خان کا خطاب دراصل منگولوں سے آیا۔ منگول کے حاکم قاآن (کاغان، خاکان) یا خان کہلاتے تھے۔ بعد میں جب منگول بادشاہی بڑھ گئی تو صوبوں کے حاکم خود کو ال خان (نائب خان) کہلانے لگے۔

بلوچستان میں خانیٹ (خانی) کے عہد میں (1840-1666ء) کلات رفتہ رفتہ ایک مؤثر اور آزاد، سلطنت میں ڈھل گیا۔ اس عبور میں ایک ایسی مقامی ارسٹوکریسی شامل تھی جس کی معاشی بنیاد تو بڑھتی ہوئی زراعت تھی مگر جس کے نمایاں ہونے کے ذرائع قبائلی طور پر منظم کردہ خانہ بدوش مویشی بانی پر مبنی تھے۔ (1) اس دور میں خان اور سرداروں کے درمیان رشتہ بہت ہی ڈھیلا ڈھالا اور کمزور تھا۔

قلات کے خان میر احمد (1666-1695ء) کے زمانے میں زراعت کے فروغ کو خصوصی دلچسپی میسر ہوئی۔ کاریزات کو ترقی ملی۔ موضع کوہنگ قلات میں کاریز کھدوائے گئے۔ جن میں کاریز ملاورد، کاریز یوسف اور کاریز عثمان مشہور تھے۔ خضدار کی ندی سے کئی نالے نکال کر پانی کو بنجر زمینوں تک پہنچایا گیا۔

اسی زمانے میں عدالتی اخراجات کے نام پر ''مالی'' نام کا ایک ٹیکس جاری کیا گیا۔ جس کے تحت ہر شادی شدہ شخص نے پانچ روپے سالانہ یا اس کے برابر اناج یا مال مویشی کی صورت میں اپنے قبیلے کے سردار کے پاس جمع کروانا تھا۔ (2)

اسی خان کے دور حکومت میں خشکابہ زمین کے مالکانہ حقوق پر مالکان اور کاشتکاروں کے درمیان ایک جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ جھگڑا یہ تھا کہ اراضی کی آمدن سے مالک کو کتنا حصہ ملے اور کسان کو کتنا۔ چنانچہ خشکابہ بندات کی آبادکاری کے چھ حصے مقرر کر دیے گیے: ایک حصہ پانی کا مقرر ہوا، ایک حصہ زمین کی دیکھ بھال کا، ایک حصہ تخم کا، ایک حصہ ہل کا' ایک نگرانی کا اور ایک حصہ حقِ مالکانہ۔ چوں کہ بندات کی کاشت کاری میں پانی دینا، بندوں کی دیکھ بحال' تخم ریزی، ہل چلانا اور فصل کی نگرانی والے سارے پانچوں کام کسان کے تھے، اس لیے پانچ حصے اُس کے ہو گئے اور

مالک مفت میں ایک حصہ لیتا تھا جسے انھوں نے حق مالکانہ قرار دیا تھا۔(3)اسی چھٹے حصے کو بدنامِ زمانہ''ششک'' کہتے ہیں۔(بلوچی میں 'شش' چھ کو کہتے ہیں)۔

1667ء میں گورنر قندہار، آغا جعفر مغل کو شکست دی گئی اور مستنگ ،کوئٹہ اور پشین کو مغلوں سے چھین کر کلات میں شامل کرلیا گیا۔یعنی اب کلات کی ریاست' پشین، کوئٹہ، مستنگ، خاران، کچھی کے شمالی علاقوں، نوشکی اور جھالاوان پر مشتمل تھی(4)۔اُدھر جنوب مشرق میں سبی و کچھی کے پٹے دار حاکم جیئند خان باروزئی(لقب نواب بختیار خان) پہ حملے کیے گئے۔ یہ تقریباً18 لڑائیاں ہوئیں ۔یہ لڑائیاں 1669ء میں شروع ہوئیں اور 1687ء تک جاری رہیں (5)۔بالآخر 29 مارچ 1687ء میں قلات میں صلح ہوئی، جس میں یہ بات شامل تھی کہ موسم سرما میں بلوچستان کے پہاڑی علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کو سیوی اور کچھی کے میدانی علاقوں میں مال چرائی کی اجازت ہوگی۔ باروزئی' خانِ قلات کا وفادار اور خیر خواہ ہوگا۔ بیرونی حملہ آور کی صورت میں خان کی مدد کرے گا۔

میر احمد 29 سال خان رہا اور 1695ء میں قلات میں وفات پائی۔(6) میر احمد خان کے بیٹے **محراب خان** نے دوسال تک خانی کی اور 1697ء میں کلہوڑوں کے ساتھ لڑتا ہوا''کرخ'' کے مقام پر قتل ہوگیا۔اس کے بعد اُس کے بھتیجے **سمندر خان** کو خان بنایا گیا۔اُس کی حکومت 1714ء تک رہی۔

یہاں ایک دلچسپ کام ہوا۔1707ء میں میر وائس نے پارس کے صفویوں کے خلاف بغاوت کردی۔اُس نے 1708ء میں کندھار میں ایک جرگہ بلوایا جس میں ناصر، بابر، ترین، کاکڑ اور بلوچ قبائل کے سربراہوں نے شرکت کی۔ جرگہ نے بغاوت کے فیصلے سے اتفاق کیا۔اپریل 1709ء میں میر وائس نے کندھار میں ابھار کی قیادت کی۔صفوی بادشاہ قتل ہوا اور اُس کی فوجوں کو شکست دی گئی۔صفویوں نے میر وائس کے خلاف 1711ء میں، اور پھر 1713ء میں فوجیں بھیجیں مگر انھیں شکستِ فاش ہوئی۔اس جنگ میں کندھار کے میدانوں کے بلوچ خانہ بدوش قبائل نے زبردست حصہ لیا(7)۔

سمندر خان کے زمانے میں شہنشاہِ ایران نے بلوچ ریاست کو اپنے ملک کا حصہ سمجھنے کے زعم میں اپنے سپاہ سالار طہماسپ بیگ کو 25 ہزار کا لشکر دیکر چڑھائی پہ بھیجا۔ بلوچ عوام نے سریاب و مستنگ کے درمیان ہزار گنجی کے مقام پر خوف ناک جنگ کے بعد ایرانی لشکر کو شکست دی اور طہماسپ بیگ کو قتل کیا۔

سخی سمندر خان اٹھارہ سال حکومت کرنے کے بعد 1714ء میں قلات میں وفات پاگیا۔(8)**عبداللہ** (1714-1734ء) خان بنا۔وہ قوی الجثہ بہادر اور خوبصورت جوان تھا۔ انگریز اُسے'' عبداللہ دی گن کرر''، کہتے تھے جب کہ میدانی لوگ اُسے'' پہاڑی عقاب''، اور شاعر لوگ اپنے اس شاعر کو''قہار'' کے نام سے جانتے ہیں۔(9)

میر گل خان نے لکھا کہ تین خان (عبداللہ خان، محبت خان اور نصیر خان اول) بلوچی زبان کے مشہور شاعر رہے۔خان عبداللہ قہار کے یہ اشعار تو ہر عام وخاص کو زبانی یاد ہیں:

کوھنگ و اے کوھیں کلات
کسے پث ئے میراث نہ یاں
ما گوں سغاراں گپتغاں

ترجمہ:

کوہنگ اور یہ قلعہ نما پہاڑ
کسی کے باپ کی ملکیت نہیں ہیں
ہم نے انھیں تلواروں کے زور سے حاصل کیا (10)

عبداللہ' نور محمد کلہوڑا کا ہم عصر تھا۔کلہوڑا کچھی پہ قابض تھے۔عبداللہ قہار کی قیادت میں بلوچ فوج نے کچھی پر حملہ کردیا۔کلہوڑوں کا نائب مرآد گنجاہ کچھی کا حاکم تھا۔بلوچوں کا باہم فیصلہ یہ تھا کہ جھلاوان کے لوگوں اور التازئیوں کو درۂ مولا کے ذریعے گنداواہ پر حملہ کرنا تھا۔جب کہ میر عبداللہ خود بولان کے ذریعے کچھی کے میدانوں میں اترا۔وہاں ڈھاڈر فتح کیا گیا۔تب قہار سنی کے قریب''جندری ہر'' نامی مقام کی طرف بڑھا۔مگر، جھلاوان کی فوج کے آن ملنے سے قبل ہی

گنداواہ کا نائب اس کے مقابلے میں آیا جس کے پاس سندھ اور کچھی کی موجود ساری فوج تھی۔ جندری ہر میں زبردست لڑائی ہوئی اور عبداللہ قہار مارا گیا۔ یہ 31-1730ء کا واقعہ ہے۔

یہاں قلات کی فوجی ساخت کے بارے میں یہ ذکر ضروری ہے کہ 1410ء میں بلوچ قبائل پر مشتمل اولین فوج تشکیل دی گئی۔ اس کے تین دستے تھے: سراوان دستہ، جہلاوان دستہ اور خاص دستہ۔ اس فوج کا تیسرا حصہ باری باری تین مہینے کے لیے قلات (جو کہ دارالحکومت تھا) کی حفاظت کے لیے آکر اپنا کام سنبھالتا۔ (11)

خوانینِ قلات میں پہلی شاہی مہر میر عبداللہ نے رائج کی۔

اس کی مہر پہ یہ شعر کندہ تھا: (12)

حاکم وقت ظل سبحانی

عبداللہ خان سکندرِ ثانی

اُس وقت تک، یعنی اٹھارویں صدی تک بلوچ سرقبیلوی نظام کی چوکھاٹ میں ایک طبقاتی فیوڈل معاشرہ وجود میں آ گیا۔ اب ہزاروں لوگ دیہی مزدور بن گئے تاکہ زائد پیداوار کر سکیں۔ سرداری اب موروثی بن چکی تھی۔ ایک قبائلی گھرانہ پورے قبیلے کے لیے ہمیشہ سربراہ مہیا کرتے رہنے کا گھرانہ بن گیا۔ اُس طائفے کا ایک شخص تو سردار ہوتا ہی تھا مگر اُس کے عزیز و اقارب اور طائفے کے دیگر ممبر بھی حکمران ہوتے تھے۔ وہ سردار کے لیے ٹیکس، عطیات اور ریونیو اکٹھا کرتے تھے۔ اس طرح انتظامی بالائی ڈھانچہ کی اجارہ داری بن گئی۔ اسی انتظامی بالائی ڈھانچہ نے قبائلی طرزِ پیداوار سے فیوڈل نظام پیداوار کی طرف عبور کی نگرانی کی۔ گو کہ عبور کی یہ رفتار بہت سست تھی۔

عبداللہ خان کا بڑا بیٹا **محبت خان** (1737ء تا 1749ء) کلات کا خان بن بیٹھا۔
اٹھارویں صدی کے پہلے حصے میں نادر شاہ اور پھر احمد شاہ نے بلوچستان پر (اور، یا بلوچستان میں سے ہو کر) کئی مہمات سر کیں، جن کے نتیجے میں دُور دُور تک ان کی سلطنت قائم ہوئی۔

نادر قلی کا تعلق ایک ترکمن قبیلے، افشار سے تھا۔ اس کے باپ کا نام امام قلی تھا جو افشار

قبیلے کا سردار اور مذکورہ قلعے کا حاکم تھا۔ نادر قلی کا باپ اُس کی کم سنی میں مر گیا تو اس کے چچا نے قلعے کی کمان سنبھالی۔ مگر جب نادر بڑا ہوا تو اس کے چچا نے اس کا موروثی حق یعنی کمان اس کے حوالے نہ کی۔ تب نادر مشہد چلا گیا۔ وہ وہاں بیگلر بیگ کی ملازمت میں بحیثیت ''نائب منتظم تقریبات'' شامل ہوا۔ (13)

نادر نے اپنے اولین حملوں میں مشہد پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے خراسان کو ابدالیوں سے بازیاب کرالیا...... مہم جُو نادر نے جائز وارث طہماسپ کے سر پر بادشاہی تاج رکھ دیا۔ خدمات کے صلے میں اُسے خراسان، مازندران، سیستان اور کرمان کی صوبیداری عطا کی گئی۔ نادر نے ''خان'' کے اضافی نام کے ساتھ ''قلی'' (طہماسپ کا غلام) کا لقب اختیار کیا۔

یہ وہ زمانہ بھی تھا جب نیدرلینڈ کے لوگوں نے بلوچوں کے ساحلی علاقوں پہ قبضہ کر رکھا تھا۔ نیدرلینڈ والوں کو ''ڈچ'' بھی کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں نیدرلینڈ اور ڈچ اتنے مشہور لفظ نہیں ہیں۔ یہاں اِن ناموں کا ایک اور متبادل مشہور ہے: ولندیزی۔ بہرحال 1721ء میں چار ہزار بلوچوں نے بندر عباس پر حملہ کر دیا۔ انھوں نے وہاں برٹش اور ڈچ فیکٹریوں (فوجی کیمپوں اور تجارتی مال کے ذخیروں) میں گھسنے کی کوشش کی مگر انھیں بری طرح شکست ہوئی۔ اور بہت سے بلوچ شہہ سوار مرگ کی آغوش میں سو گئے (14)۔

1736ء کے موسم خزاں تک نادر شاہ مسلسل کبھی ترکی کے ساتھ محاذ آرائی میں اور کبھی محمد خان بلوچ کی بغاوتیں کچلنے میں مصروف رہا۔ (15)

جب نادر شاہ کی فوجیں پیر محمد اور الماس خان کی سرکردگی میں 1736ء میں بندر عباس اور مکران کے ساحل سے بلوچستان میں داخل ہوئیں تو بلوچوں نے اُن کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر انھیں شکست ہوگئی۔ وہ دونوں ایرانی جرنیل اُس کے بعد شال (کوئٹہ) پہنچے۔ وہاں سے انھوں نے قلات کا رخ کیا۔ ان کی فوج کو اس دفعہ پانی کی قلت کا سامنا رہا۔ لیکن پیاسے ایرانیوں نے بڑی بے جگری سے میر محبت خان کی فوج کو ایک بار پھر شکست دی۔ اب محبت خان اپنے قلعے مستنگ کو فرار ہو گیا۔ (16)

اس دوران نادر نے کندھار فتح کرلیا۔حملہ آوروں کی مزاحمت کا خیال چھوڑ کر محبت خان نادرشاہ کے پاس قندھار جا کر سلامی ہوا۔نادر نے جواب میں دو مہربانیاں اُس پہ کیں:

1۔محبت خان کو قلات کا ناظم مقرر کیا۔

2۔اُس کے لیے سب سے بڑے خطرے یعنی الناز خان اور اس کے کم سن بھائی نصیر خان اور اس کی والدہ مریم اور ان کے طرف داروں کو بطور یرغمال ایرانی دربار میں رکھنے پر تیار ہو گیا۔(17) تا کہ محبت خان ان مخالفین سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کرے۔

اُن کے علاوہ سلطان زہرو خان بنگلزئی اور ملا محمد علی کو بھی یرغمال کر کے نادر شاہ کے پاس پہنچا دیا گیا۔

مگر بھلا حاکم کے غلام بن جانے سے عام بلوچ کبھی اپنی آزادی سے بھٹکا؟ چنانچہ حاکم محبت خان کی اطاعت کے باوجود بلوچستان میں عوامی مزاحمت کم نہ ہوئی اور پیر محمد اور الماس خان کو مزید کچھ عرصہ وہاں مصروف پیکار رہنا پڑا۔ایک طویل محاصرے کے بعد قلعہ جالک فتح ہوا(18)۔ چنانچہ 1738ء کے اوائل تک بلوچستان کا بہت بڑا علاقہ پوری طرح زیرنگیں ہو چکا تھا(19)۔

1739ء میں نادر نے اپنے جنرل، تقی خان کو مکران کے راستے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔گوادر، بلیدیوں سے چھن کر ملک دینار گچکی کے ہاتھوں میں آ گیا۔گچکی کی ایک شاخ نے پنجگور سنبھال لیا اور دوسری شاخ، کیچ اور گوادر کی حاکم بنی۔

فروری 1739ء میں کرنال کے مقام پر ایرانی اور ہندوستانی فوجوں کے درمیان لڑائی میں نادر جیتا اور دہلی پہنچ گیا۔دہلی میں قتلِ عام کے بعد غارت گری اور لوٹ مار کا طوفان مچا۔نادر نے شاہی خزانہ لوٹ لیا۔سرسری اندازے کے مطابق لوٹ مال کی مالیت یہ تھی:

1۔ نقد، ساٹھ لاکھ

2۔ سنہری اور روپہلی ظروف، مالیت ایک کروڑ

3۔ جواہرات، پچاس کروڑ

امرا، جن سے روپیہ لیا گیا:

1۔ اعتمادالدولہ وزیراعظم۔30لاکھ

2۔ آصف جاہ۔30لاکھ

3۔ سعادت خان۔ایک کروڑ

تاریخی نوادرات میں دو چیزیں شامل تھیں:

1۔ کوہِ نور

2۔ تختِ طاؤس (20)

جب اگلے سال یعنی 8 مارچ 1740ء میں نادر افشار لاڑکانہ پہنچا تو بی بی مریم نے اُس کی خدمت میں عرض کیا کہ میاں نور محمد خان کلہوڑا نے اس کے خاوند امیر عبداللہ کو ناجائز قتل کیا، اس کا خون بہا دلایا جائے۔چنانچہ، نادرشاہ نے کچھی اور سیوی کا علاقہ عبداللہ خان کے خون بہا میں محبت خان کو دے دیا۔اس طرح کچھی اور سیوی کا سیاسی تعلق اور انتظامی بندوبست واپس بلوچستان کو منتقل ہو گیا۔چوں کہ عبداللہ قہار کے ساتھ سراوان دستہ کے کئی ایک سردار اور اُن کے قبائل کے لوگ 11 فروری 1731ء کی جنگ بمقام چندری ہڑ کام آئے تھے، لہٰذا ان سب کا خون بہا دینا لازمی تھا۔اس لیے محبت خان نے کچھی کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا:

(i) ایک حصہ عبداللہ قہار کے خون بہا میں عبداللہ خان کی ملکیت قرار دیا۔

(ii) دوسرا حصہ اُن قبائل کے لیے مخصوص کر دیا گیا جنھوں نے اگرچہ اس لڑائی میں عبداللہ قہار خان کے ساتھ شرکت نہیں کی تھی مگر ان کی گزشتہ خدمات زبردست تھیں۔یہ حصہ بھی خان کے قبضہ میں رہا جسے خان اپنی صوابدید کے مطابق دوسرے سرداروں اور ان کے قبائل یا خاص افراد کو وقتاً فوقتاً ان کی اہم جنگی خدمات کے صلے میں انعام کے بطور دیتا رہا۔

(iii) تیسرے حصہ کو بطریقِ ذیل قبائلِ سراوان میں تقسیم کیا گیا۔اس لیے کہ عبداللہ قہار کے ساتھ اس آخری جنگ میں صرف سراوان کے قبائل تھے۔جہلاوانی لشکر آخری دم تک کچھی نہیں پہنچ سکا تھا۔اس لیے قبائلِ جہلاوان کو کوئی زمین بعوضِ خون بہا نہیں دی گئی۔

سراوان قبائل میں کچھی کا علاقہ اس طرح تقسیم کیا گیا:

1۔قبیلہ رئیسانڑیں کے خون بہا میں موضع مٹھڑی

2۔شاہوانڑیں کے خون بہا میں موضع حاجی

3۔قبیلہ لہڑی کے خون بہا میں موضع ہانبی

4۔قبیلہ بنگلزئی کے خون بہا میں موضع چندڑ

5۔قبیلہ رودینی کے خون بہا میں موضع تاج

6۔قبیلہ محمد حسنی کے خون بہا میں کوگڑو

7۔محمد شہی کے خون بہا میں موضع زرداد

پانچ ہزار میل کے اس نئے علاقے نے کلات میں گویا ایک معاشی انقلاب برپا کر دیا۔ یہاں سے زرعی اجناس کی صورت میں کلات کو زبردست آمدن حاصل ہوتی رہی اور خانی بہت مضبوط ہوتی گئی۔اس کے علاوہ زراعت میں ایک اہم نوع در آئی۔کچھی میں دریاؤں پر بند باندھ لیے جاتے تھے اور اُس سے کاشت کی زمینوں کو سیراب کیا جانے لگا۔ یہ نیا طریقہ تھا۔خود قلات میں سیلابی نالوں کے علاوہ ''کاریز'' آبپاشی کے بڑے ذرائع تھے۔

کچھی میں سیلابی پانی سے آب پاشی ہوتی تھی۔دریا کے کناروں پر آباد ہر گاؤں نے مٹی کا ایک بند باندھ رکھا تھا تاکہ سیلابی پانی کو روکا جائے۔جب ان کی زمینیں سراب ہوتی تھیں تو وہ یہ بند توڑ دیتے تھے تاکہ نچلے گاؤں کے زمینداروں کا بند بھر جائے اور وہ بھی نالے نکال کر اپنی زمینوں کو سراب کر سکیں۔یہ زبردست محنت کا کام تھا۔100 جوڑے بیل پورا مہینہ کام کرتے تھے۔اس سالانہ عمل کی نگرانی گاؤں کے بڑے افسر کرتے تھے جن کے پاس بڑی بڑی زمینیں تھیں۔یہ افسر موروثی ہوا کرتے تھے۔

کچھی میں کئی فصلیں کاشت ہوتی تھیں۔سیلابی زمینوں پر تو کپاس، دالیں اور تیل کا بیج کاشت ہوتے تھے۔جب کہ نیل، گندم، جوار، کپاس اور میوہ و سبزیاں محدود مستقل پانی والے علاقوں میں ہوتی تھیں۔تقسیمِ کار اور تقسیمِ پیداوار بہت پیچیدہ اور متنوع ہوا کرتا تھا۔خرچے کی بابت عموماً کسان بیج بھی دیتا تھا، ایک بیل کا جوڑا بھی اور جانوروں کی غذا بھی۔فصل کی پیداوار تین

حصوں میں تقسیم ہوتی تھی۔یعنی' حکمران طبقات، زمین کے مالک اور کسان میں۔حکمران طبقات میں خان فیملی یعنی احمد زئی' قبائلی سردار' اور قبیلے کے ذیلی فرقوں کے بڑے آتے تھے۔

چھوٹے قطعات پر زمین کا مالک خود ہی کاشت کیا کرتا مگر بڑی بڑی زمینوں والے لوگ بزگر رکھا کرتے تھے۔ارباب اور رئیسوں کے علاقے میں کاشت کار ''جٹ'' ہوتے تھے۔

بہت سی صورتوں میں ملکیت کے حقوق بلوچوں کو منتقل ہوئے یا انھوں نے قوت سے حاصل کیے۔لہٰذا ڈومبکی اور مغیری بالترتیب لہڑی اور بھاگ کے قریب جلال خان کے علاقے کے مالک بنے، کہیری' چھتر پلیجی کی ملکیت کا دعویٰ کرنے لگے اور مگسی سردار اپنے قبائلی علاقے کا واحد دعوے دار بنا۔

رفتہ رفتہ زراعت میں ایک اور صورت بھی پیدا ہوگئی۔جب مالک نے دیکھا کہ اس کے پاس خود کاشت کرنے سے زیادہ زمین آ گئی ہے اور بڑے بڑے بند باندھنا اُس کے بس سے باہر تھا، تب یوں ہونے لگا کہ مالکوں نے زمین کاشتکاروں کو دی جنھیں آبادکار' راہک، یا، لٹ بند کسان کہتے تھے۔ان کے ساتھ معاہدہ اُس وقت تک رہتا جب تک وہ بند یا گنڈھا سلامت رہتا۔اس کے ٹوٹنے پر معاہدہ بھی ختم ہو جاتا تھا۔(21)

اس محنت طلب نظامِ آبپاشی نے ہر گاؤں کو ایک اجتماعی پیداواری یونٹ بنا دیا تھا۔اس کی بنیاد پر اناج کی تقسیم (بٹائی) ہوتی تھی۔جہاں بڑے بڑے حصے تو حاکم لوگوں اور مالکوں کے ہوتے تھے مگر آبپاشی کے خرچ کا حصہ' ریونیو حکام کا حصہ، اور گاؤں کے سپیشلسٹوں کا حصہ بھی الگ کیا جاتا تھا۔حاکم لوگ فصل میں سے اپنا حصہ پہلے لیتے تھے۔اس طرح انتظامیہ اور آبپاشی کا خرچہ گاؤں والوں کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔

یوں کچھی نے بلوچ ریاست کو قبائلی کی بہ نسبت ایک فیوڈل سلطنت کی طرف دھکیلنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

پیٹر دی گریٹ، نصیر خان نوری

نادر کے دربار میں احمد زئی خاندان کے دو بھائی نصیر خان اور اہلتاز خان یرغمالی کے بطور موجود تھے۔اسی دوران احمد خان ابدالی بھی نادر کے حضور میں ایک معتبر شخص تھا۔

18 جولائی 1783ء میں کندہار میں نادر ترکمن کے دربار کے اندر یرغمالی گیری کے دوران ہی اہلتاز خان اور نصیر خان کے درمیان جھگڑا ہوا۔دربار کے اندر ایک مسئلہ پر تلوار سونت لینے کی نوبت آئی۔اور اہلتاز خان خود اپنے بھائی نصیر خان کی تلوار سے قتل ہوا۔

درباریوں کی سفارش کی بدولت نادر نے نصیر خان کو معاف کیا۔یوں گیارہ سال تک نصیر خان، نادر کے سفر وحضر میں اس کا خاص آدمی تھا۔

نادر کے دربار میں گیارہ سال (1747-1736ء) گزارنے کے دوران نصیر خان نے بہت کچھ سیکھا۔وہ اُس کی فتوحات میں اُس کے ساتھ رہا۔اُس کے ساتھ اس نے بے شمار مصائب جھیلے۔ان مصائب نے اُسے جفاکش اور مستقل مزاج بنا دیا۔اس نے محمد شاہ رنگیلا کی ذلت، دہلی کا قتلِ عام، جنگ میں نادر شاہ کی بہادری اور تکنیک، اور اس کی فوجوں کی ساخت کا اچھی طرح مشاہدہ کیا۔یہیں پر وہ احمد خان ابدالی اور شاہ ولی سے واقف ہوا۔شاہ ولی جو بعد میں احمد خان کی حکمرانی کے زمانوں میں مقتدر وزیر اور ''اشراف الوزرا'' کے لقب سے نوازا گیا تھا، میر نصیر خان کا بہت بڑا حامی تھا۔(22)

دراصل 17ویں صدی کے آخری نصف سے جب میر احمد خان نے کنفیڈریسی کی بنیاد

رکھی تھی تو بلوچ میں ایک سیاسی صورت وجود میں آ گئی تھی۔قبیلوی ارسٹوکریسی کے عنصر نے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔قدیم قبیلوی ڈیموکریسی کمزور ہوتی گئی اور اس کی جگہ پر پری فیوڈل سرداری نظام مستحکم ہوتا گیا۔بلوچ سماج میں فیوڈل نظام کی عظیم الشان بلوغت نے سارے بلوچ عوام کو ناترسی کے ساتھ استحصال کے پنجوں میں دبوچا۔میر احمد خان کے نواسے میر نصیر خان کو اِس فیوڈلزم نے بالآخر زبردست حاکم بنوا دیا۔اور اس نے احمد خان ابدالی کے ساتھ مل کر ہندوستان فتح کر لیا اور بلوچستان کو خوب ترقی دی۔

سدوزئی قبیلے کے سربراہ زماں خان ابدالی کا بیٹا احمد خان، 1722ء میں ملتان میں پیدا ہوا۔جوان ہوکر نادر شاہ کا آلہ کار بنتے ہوئے وہ اُس کی ملک گیری وتوسیع پسندی کی ہوس میں سرگرم حصہ لیتا رہا۔اس کی بے پناہ وفاداری سے متاثر ہوکر نادر شاہ نے اسے اپنے پرسنل سٹاف میں شامل کر دیا۔جس کے بعد احمد خان کو شاہ کے ذاتی محافظوں کا سربراہ بنا دیا گیا۔اس نے اپنے آقا کی خدمت اس قدر وفاداری، جان نثاری اور دلسوزی سے کی کہ نادر شاہ نے اسے اپنے شاہی حرم سرا کے دروازے پر متعین کیا۔(23)

نادر شاہ افشار جون 1747ء میں قتل ہوا۔اس کی موت کے بعد جب اس کے سپہ سالار ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے تھے تو میر نصیر خان، امیر کمال خان التازئی، سردار زہرو خان بنگلزئی، داروغہ مہر علی، اور علی خان داروغہ اپنے دیگر تین چار سو بلوچ یرغمالیوں کے ساتھ مشہد سے شیراز کی طرف روانہ ہوئے۔وہاں سے کیچ اور آب ندی میں پڑاؤ کیا۔نصیر خان بلوچستان میں اپنے بھائی محبت خان کی جگہ تخت پر بیٹھا۔

ادھر احمد خان ابدالی نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد خراسان کے ایک بہت بڑے علاقے میں سے زبردستی راستہ بنایا اور قندہار کے مضافاتی علاقوں کو تاخت وتاراج کیا۔وہاں 30 لاکھ روپے کا خزانہ جو نادر شاہ کے ہمراہ تھا اس کے ہاتھ لگا۔1747ء میں ابدالی، قزلباش، بلوچ اور ہزارہ سرداروں کے تعاون سے 23 برس کی عمر میں ''احمد خان'' نے ''احمد شاہ'' کے لقب سے قندہار کے بادشاہ کے طور پر اپنی تاجپوشی کروادی۔اس کی عمر 20 اور 30 سال کے درمیان تھی (24)۔پھر اُس

نے غزنی میں نادر کے زمانے سے چلے آئے حاکم کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ کابل اور پشاور فتح کرنے کے بعد اس نے پھرتی سے دریائے سندھ کو عبور کیا اور اٹک میں اپنا پنجہ گاڑ دیا۔(25)

پیر آف چمکنی نے 1748 میں اُسے ''دُرِ دوران'' کا ٹائٹل دیا۔ اسی زمانے سے ابدالی قبیلہ ''درانی'' کہلانے لگا۔(26)

اپنے 26 سالہ عہدِ حکومت میں احمد شاہ نے اپنی سلطنت کو ہندوستان پر سات یا آٹھ حملوں کے ذریعے مضبوط بنایا۔ ان حملوں سے اس کے خزانوں میں دولت آئی، مزید حملوں کے مواقع ملے اور سلطنت وسیع ہوتی گئی۔

فوجی تنظیم

سلیگ ہیریسن نے نصیر خان کی قیادت میں بلوچ فوجی قوت کے بارے میں لکھا: ''اُس نے 25 ہزار کی فوج اور ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل ایک متحدہ بلوچ آرمی قائم کی۔ اپنی تاریخ میں پہلی بار بلوچ قبائل ملٹری تنظیم اور بھرتی کے ایک متفق نظام کے تحت یکجا ہوئے''۔ (27)

نصیر خان اِن سارے تجربات سے گزر کر کندن بن چکا تھا۔ بالخصوص عسکری امور میں اس نے کمال حاصل کیا تھا۔ کلات خانیٹ میں غمِ لشکر ایک مقرر کردہ فوجی امداد کو کہتے تھے جو حکومت اپنے قبائل سے جمع کر کے بوقتِ جنگ امداد کی صورت میں سپر پاور کو دیا کرتی تھی۔ ''سان'' اس غمِ لشکر کا بارہواں حصہ ہوتا تھا جو ہر وقت حکومت کی خدمت میں حاضر رہا کرتا تھا۔ ہر قبیلے کے دستہِ سان کے ساتھ اس قبیلے کے سردار کے بیٹے، بھائی یا کسی اور رشتہ دار کا جانا ضروری ہوتا تھا جو اپنے آدمیوں کا ہر طرح سے ذمہ دار ہوتا تھا۔ یہ دستے سال بسال انھی قبیلوں کے افراد سے تبدیل ہوا کرتے تھے۔

1۔ دستہِ خاص: اس دستے کو اس نے قیامِ امن اور ہنگامی ضرورتوں کے لیے اپنی قوت کے طور پر براہ راست اپنے ماتحت رکھا۔

قبیلہ	تعداد	قبیلہ	تعداد
مینگل	ایک ہزار	کمبرانڑیں	پچاس
لاسی	ایک ہزار	التازی	پچاس
خارانی	ایک ہزار	گرگناڑی	ایک سو
سنجرانڑیں	ایک ہزار	سمالانڑی	دوسو
مری	ایک ہزار	دہوارکلات	ساٹھ
بگٹی	ایک ہزار	جمالی	دوسو
دیرجاتی	دوہزار	رودینی	دوسو
مکرانی	ایک ہزار	کلندرانڑیں	ایک سو
میروانڑیں	ایک ہزار		

2۔ دستہِ سراوان: اس فوج میں تمام جنگی افراد قبائلِ سراوان سے ہوتے تھے۔ دستہِ سراوان کا سپہ سالار پہلے شہوانڑیں کا سردار ہوتا تھا۔ لیکن بعد میں اس کی جگہ رئیسانڑیں کے سردار کو اس دستے کا سپہ سالار بنایا گیا۔

قبیلہ	تعداد
رئیسانڑیں	تین سو
کچھی کے مختلف قبائل	تین ہزار
بنگلزئی	سات سو
دہوار مستنگ	پچاس
محمد شہی	تین سو
خان گڑھ کے مختلف قبائل	پانچ سو
لہڑی	سات سو

نصیرآباد کے بلوچ	پانچ سو
لانگو	سات سو
ساتک زئی	چالیس
شاہوانڑیں	آٹھ سو
کوڑد	پانچ سو
سرپرہ	تین سو
رند	ایک ہزار
پرکانڑیں	ایک سو پچاس

3۔ دستۂ جہلاوان: اس دستہ میں جہلاوان کے قبائل شامل ہوتے تھے۔ پہلے اس کا سپہ سالار التازئی قبیلے کا سردار ہوا کرتا تھا بعد میں زہری کے سردار کو اس کا سپہ سالار بنادیا گیا۔

قبیلہ	تعداد
زہری	ایک ہزار
ساسولی	تین سو
محمد حسنی	آٹھ سو
خدرانڑیں	ایک سو
بزنجو	تین سو
نیچاری	ایک سو
مینگل	ایک ہزار
جتک	ایک سو
مگسی	ایک ہزار
باجوئی	ایک سو

ساجدی	ایک سو
پندرانڑیں	ایک سو
دینارزئی	ایک سو
لاشاری	ایک سو

سرِ سرداراں کے ماتحت اس علاقے کے تمام سردار اور اُن کے قبائل ہوتے تھے۔ ہر سردار کا قبیلہ مختلف ٹکّروں، پاڑوں اور پاذغوں میں تقسیم تھا۔ ہر ٹکّر پر ایک ٹکری، ہر پاڑہ پر ایک معتبر، ہر پاذغ پر ایک سفید ریش مقرر ہوتا تھا۔ اس طرح ہر دستہ مختلف قبائل اور ہر قبیلہ مختلف گروپوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ تمام سفید ریش اپنے معتبروں کے اور تمام معتبر اپنے ٹکریوں کے اور تمام ٹکری اپنے قبیلے کے سردار کے اور تمام سردار اپنے علاقے کے سرِ سرداران کے ماتحت ہوتے تھے۔ سرِ سرداران اپنے ماتحت سرداروں اور قبائل کے متعلق خان کو جواب دِہ ہوتا تھا۔

جس طرح کہ خان نے اپنی طاقت کو محسوس کرانے کی خاطر ایک دستۂ خاص براہِ راست اپنے ماتحت رکھا تھا، اسی طرح قبائلی سردار کے پاس اس کے اپنے قبیلہ کی طاقت بھی ہوتی تھی۔

غم لشکر کے تناسب سے ہر قبیلہ کو جدا جدا اراضیات دی گئی تھیں۔ انھیں غمی اراضیات کہا جاتا تھا۔ یہ زمینیں قبائل کی ملکیت نہیں ہوتی تھیں۔ اس لیے قبائل کو ان کے بیچنے اور تقسیم کرنے کا اختیار نہ تھا۔ بلکہ یہ ایک قسم کی مشترکہ قبائلی جائیداداوں کی صورت میں تھیں۔ ہر سردار اپنے قبیلہ سے اور سرِ سرداران اپنے صوبے سے عندالطلب مقررہ تعداد کا غمی لشکر جمع کرنے کا ذمہ دار تھا۔ اس لشکر کا بارھواں حصہ بطور سان ہر وقت خان کے پاس موجود ہوتا تھا۔

دستۂ خاص، خان کے پاس دارالحکومت کلات میں موجود رہتا تھا۔ اس کی کل نفری بارہ سو ہوتی تھی۔ لشکر کشی کے وقت مندرجہ ذیل قبائل اپنے حصہ رسدی لشکر کشی کے لیے شامل ہوتے تھے۔

دستہ سراوان اور جہلاوان اندرونی طور پر پھر تین تین چھوٹے دستوں میں تقسیم تھے اور جو

جوقبائلی ان چھوٹے دستوں میں شریک تھے ان کو ''پلوشریک'' کہا جاتا تھا۔

دستہِ سراوان کے تین چھوٹے دستے اوران دستوں کے پلوشریک معہ تعدادغم لشکر حسب ذیل تھے:۔

اول،دستہ رئیسانڑیں:(پلوشرخ)

قبیلہ رئیسانڑیں تین سو،قبیلہ کوڑد پانچ سو،ساتکزئی چالیس،لانگوسات سو۔

دوم،دستہ شاہوانڑیں:(پلوشریک)

شاہوانڑیں آٹھ سو،محمد شہی تین سو،سرپرہ تین سو۔

سوم،دستہ بنگلزئی:(پلوشریک)

لہڑی سات سو،بنگلزئی سات سو،رند ایک ہزار۔

دستہ جھلاوان کے تین چھوٹے دستے اوران کے دستوں کے پلوشریک مع تعدادغم لشکر حسبِ ذیل تھے:

اول ،دستہ زہری :(پلو شرخ) زہری ایک ہزار،قبیلہ نیچاری ایک ہزار،جتک ایک سو،ساسولی تین سو۔

دوم دستہ مینگل (پلوشرخ) مینگل ایک ہزار، بزنجو تین سو، خدرانی ایک سو،ساجدی ایک سو،محمد حسنی آٹھ سو

سوم،دستہ مگسی:(پلوشریک) مگسی ایک ہزار، دینارزئی ایک سو،لاشاری ایک سو

دستہِ خاص :(پلو شریک) میروانڑیں ایک ہزار،کمبرانی پچاس،ذگر مینگل ایک ہزار،گرگناڑی ایک سو،کلندرانی ایک سو،سمالانی دوسو،رودینی دوسو

دورانِ جنگ لشکریوں کو آٹا اوران کے گھوڑوں کو بھوسہ اوردانہ خان کی طرف سے دیا جاتا تھا۔سرداروں کو جیرہ (راشن) ملتا تھا۔

******

نصیر خان ''دی گریٹ'' کے پاس دومُہریں تھیں۔ان میں سے ایک مہر وہ تھی جس میں کہ اس کا نام بھی آتا تھا:

حسبنا الله نعم الوکیل

ونعم المولی و نعم النصیر

1175ھ

دوسری مہر درباری زبان فارسی میں تھی:

جو لطف خدا دستگیرِ من است

محمد براعد النصیرِ من است

(28)

جیسے کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ خان نے دستہِ خاص کے نام سے ایک فوج دائمی طور پر مرکز میں اپنے پاس رکھی ہوئی تھی۔اس کے علاوہ ہر قبیلہ پابند تھا کہ خان کی طلبی پر ایک مقررہ تعداد میں فوج مہیا کردے۔مالیہ جمع کرنے کے لیے اس نے منظّم دفتر قائم کیے۔اس نے سرداری کو دربار کے تابع کردیا۔سارے چھوٹے فیوڈل (قبائلی سردار) ایک بڑے فیوڈل (خان) کی حاکمی کے زیر اثر تھے۔قبیلوں کے مابین جھگڑوں کے فیصلوں کا قطعی اختیار خان کو حاصل تھا۔

مندرجہ ذیل فرمان نصیر نوری نے جاری کیا جو انگریز دور تک برابر بلوچ ریاست میں نافذ رہا۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

فرمان ہدایت خان اعظم میر نصیر خان نوری در 1159ھ

1۔سرود وطنبورو نے وچنگ ودف وغیرہ سرود ہادر بدعت خانہائی فقیراں وشادی وسنت نہ شود۔

2۔مردان وزنان در عروسی بازی رقص نہ کنند۔

3۔بنج وچرس وغیرہ مسکرات نہ خورند وزراعت بنج ہم نہ کنند۔

4۔ضعیف (زنان) روبرہنہ در بازار و کوچہانہ گردند۔

5۔سیر وصحبت کہ جوانان جمع شدہ درتکیہ ہا وغیرہ جاء ہا گوسفند کشتہ جشن می کنند سر بدعت آں است احدے نہ کنند۔

6۔سودائے برید کہ بیع سلم است بغیر اتفت شرط شریعت نہ کنند۔

7۔مردانِ وزنانِ مسلماناں در ماتم ہاسر برنہ کردہ روی وجان نخراشیدہ وخون نہ کردہ نوحہ نہ نمایند۔

8۔دردائرہ فقیران مسلمان رانشستن نہ گزارند ومردم مسلمانان زلف نہ گزارند۔

9۔نماز جمعہ رااستوار داشتہ درشہر ہا ناغہ نہ کنند وہرکس بہ مسجد ہاناں پختہ ہرمحلّہ ملا ہائے مساجد خود رابد ہند ونماز ہادراول وقت خواندہ تبنگ وقت نہ گزارند

10۔مردان وزنان راتہمت ناحق بہ زنا می دہند ہشتاد درہ بہ تہمت دہندہ زدہ بہ سخنش باور نہ کنند پسر و دختر رابے گناہ ایذانہ رسانند۔

11۔شیخ ہا کہ برسرموی می گزارند وبرسر بیمار ایشاں رامی برند وسرموئی آنہاں راتراشیدہ وبرسر بیمار بروں نہ گزارند وبہ گفتۂ ایشاں باور نہ کنند۔

12۔گوسفند برسرقبرستان وسنگ وآستانہ نہ کشتہ دردی خونی فرزندوعروسی واسپ وغیرہ نہ کنند وگوشت آں حرام مطلق است۔

13۔ازمال زکواۃ چہل یک بدہند ودرزینہار کسی خراج نمی دہندہ یک زکواۃ بدہند

14۔مسلمان وہندوان راسود گرفتن نہ گزارند

15۔خیالات ہریک ملا نگاہ داشتہ بہ اوخیرات دادہ نماز باجماعت بکنند استوار بودہ احدے وفردے قدم از دائرہ شریعت بیرون نہ گزاشتہ موجب دلالت ومنبع فضیلت پناہ مشارُالیہ بعمل آوردہ ہیچ تخلف وانحراف نہ درزیدہ دریں باب تاکیداکید وقدغن بلیغ دانستہ حسب المقر رداشتہ درعہدہ شاسند۔

تحریر فی التاریخ 25 جمادی الثانی 1159ھ

مہر شریف

حسبی اللہ ونعم الوکیل

نعم المولی ونعم النصیر۔(29)

******

نوری نصیر خان واقعتاً ایک سخت گیر مذہبی خیالات کا مالک تھا۔جس کو اُس نے سیاست میں خوب استعمال کیا۔بالخصوص مکران پہ حملہ کے لیے اُس نے ذکری فرقے کو نیست ونابود کرنے کا مذہبی بہانہ بنایا۔وہاں ذکری کی اچھی خاصی آبادی قتل ہوئی۔بقیہ کا ایک حصہ ریاستِ کلات کے حدود سے دور لیاری جا کرآباد(دراصل دربدر) ہوا۔

واضح رہے کہ قلات کے احمد زئی خانوں کی نگاہیں پہلے ہی مکران پر تھیں اور بہت عرصہ قبل میر عبداللہ نے 1723ء میں یہاں حملہ کیا تھااوراس کے بھائی اور جانشین میر نصیر خان نے اس علاقے پر 9 حملے کیے۔نصیر خان نے پنجگور زیر کرلیا۔پھر وہ کیچ کی جانب بڑھا اور ناصر آباد پر قبضہ کر لیا۔تب گچکیوں کی طرف سے احمد شاہ درانی کی مدد طلب کی گئی اور نصیر خان نے افغان بادشاہ کے حکم سے فوراً قلات پسپائی اختیار کی۔مگر، بہت جلد ہی ایک اور فوج ملک دینار کے خلاف بھیج دی گئی، جس کے نتیجے میں ملک دینار کو گرفتار کر کے قلات لایا گیا، جہاں اُسے قتل کر دیا گیا۔

نصیر خان نے کیچ وپنجگور پر قبضہ کرلیا۔کسر قند تک پیش قدمی کی اور دیزک اور خاران کے راستے قلات واپس آیا۔مکران کے حاکم گچکی سردار مجبور ہوئے کہ اپنے لگان کا آدھا حصہ اس کے حوالے کر دیں۔

اس طرح میر نصیر خان نے مرکزیت والی ایک حکومت بنا ڈالی۔

غلاموں کی تجارت

نصیر خان کی حکمرانی دراصل ایک فیوڈل انقلاب کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ عہد بہت شاندار تو تھا مگر ایک فہمیدہ، جہاندیدہ اور عوام کے نبض شناس خان کی طرف سے مکمل فیوڈل طریقے سے شاندار تھا۔عام عوام کے لیے اس شانداریت میں کچھ بھی نہیں رکھا ہوا تھا۔اُس کی حکمرانی بلوچ معاشرے کی قبائلی تنظیم کے اوپر کھڑی تھی جس میں زرعی غلامی (سرف) بھی موجود تھی اور منقولہ

جائیداد کی طرح منقولہ غلامی پہلے ہی سے مروج تھیں۔نصیر خان کی فتوحات نے بلوچستان میں غلامی کی دوسری شکلیں بھی متعارف کرادیں۔

غلامی پورے بلوچستان میں عام تھی اور کوئی بھی ایسا ممتاز خاندان نہ تھا جس کے پاس غلام مرد یا غلام عورت نہ ہو۔یہ غلام عام طور پر شیدی یا نیگرو یا سانولے لوگ ہوتے تھے جو جنگی قیدی ہوتے تھے یا پھر جنھیں ساحلی شہر سے خریدا جاتا تھا۔(30)

بلوچستان (مکران) کا ایک حصہ اومان کے سلطان کے پاس 1783ء سے لے کر 1958ء تک رہا۔اٹھارویں اور انیسویں صدیوں میں اومان زنجیبار (تنزانیہ) پر بھی حکمرانی کرتا تھا۔جو کہ غلاموں کی بہت بڑی منڈی تھی۔یہ غلام، اومان اور ایران کے راستے مکران کے ساحل پر لائے جاتے تھے۔غلامی اور غلاموں کی خرید وفروخت باقاعدہ رواج کی حیثیت رکھتی تھی۔نہ صرف شہروں میں غلام رکھے جاتے تھے بلکہ کراچی کو اندرونی علاقوں میں غلام مہیا کرنے کے لیے ایک بڑی منڈی کی حیثیت حاصل تھی۔سالانہ چھ سو سے سات سو تک غلام درآمد کیے جاتے تھے جن میں تین چوتھائی عورتیں ہوتیں تھیں۔(31)علاوہ ازیں یہ غلام افغانستان تک لے جائے جاتے تھے۔افغانستان میں ،1923ء میں غلامی کے خاتمے تک ،کندہار، بلوچستان کے خاران سے لائے گئے غلاموں کی مشہور منڈی ہوا کرتا تھا۔غلاموں کی مانگ اس لیے بڑھ گئی تھی کہ بلوچ فیوڈلوں (سندھ میں تالپر اور بلوچستان میں خوانینِ قلات) نے بلوچ جنگ جو سرداروں کو جاگیروں کے ساتھ غلام اور لونڈیاں بھی عطا کرنی شروع کی تھی۔

ان غلاموں سے زراعت جیسے پیداواری کام نہیں لیے جاتے تھے بلکہ فیوڈل انھیں زیادہ تر محلات کے محافظ بناتے تھے یا گھریلو ملازم رکھتے تھے۔اشرافیہ، زمینداروں اور تاجروں کے گھروں میں بیگمات کی خدمت کے لیے نو عمر افریقی لڑکیوں کی بہت مانگ تھی۔اس کے علاوہ سردار،لوگ سفر کے دوران ان غلاموں کو ساتھ رکھتے تھے۔

وہ وفادار ہوا کرتے تھے،اس لیے کہ بھاگنے کا نہ تو راستہ معلوم تھا اور نہ آزادی کا کوئی آسرا تھا۔یہی غلامی ہی ان کا مقدر تھی اور اسی فیوڈل کا گھر 'ان کی جائے پناہ۔پھر بھی بھگوڑا پن سے

روکنے کی خاطر غلام اور لونڈیوں کے سر کے بال اتارے جاتے تھے۔اس کام کے لیے وہ سوکھا چونا (جس چونے پر پانی نہ ڈالا گیا ہو) استعمال کرتے تھے۔اس وحشیانہ اقدام کے بعد بال دوبارہ اگتے ہی نہ تھے۔

انھیں خصی البتہ نہیں کیا جاتا تھا بلکہ لونڈیوں کے ساتھ بیاہ دیا جاتا تھا۔غلاموں کی خوراک اور لباس کا اختیار آقا کو حاصل تھا۔(32)اسی طرح آقا اپنے غلاموں کی زندگی اور موت پر قدرت رکھتے تھے۔

ایک اور بات بھی تھی۔اومان کے حکمرانوں نے بلوچوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا تھا۔ان کے کھجوروں کے باغات میں کام کرنے والے افریقی غلاموں کے علاوہ ان کی فوج میں بھی افریقی غلام بطور سپاہی شامل تھے۔1872ء میں قلات کے حکمران نے گوادر اور اس سے ملحق ساحلی علاقوں کا کنٹرول اومان کے حوالے کر دیا۔اس طرح افریقی غلاموں کی بلوچستان میں بہتات ہوگئی۔

چارلس میسن نے قلات میں بلوچ اور افغان نسل کے کچھ غلام بھی دیکھے تھے۔ان کی حالت البتہ نیگرو غلاموں سے بہتر تھی۔غلاموں کے کپڑوں اور خوراک کے بارے میں کوئی خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔خانہ زاد غلاموں (وہ غلام جو اپنے مالکوں کے خاندان میں پیدا ہوتے تھے) غلاموں کا زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔شاغاسی نور محمد، داروغہ گل محمد اور رحیم داد سب خانہ زاد تھے۔(33)

بلوچستان کے کراچی کے علاوہ ،اس کے دوسرے ساحلوں پر بھی غلاموں کی تجارت ہوتی تھی۔عرب لوگ ،مشرقی افریقہ کی بندرگاہوں سے غلام حاصل کر کے انھیں بحر ہند میں سے سیدھا مسقط و اومان لاتے اور گوادر، پسنی اور جیونی کی بندگاہوں پر لا کر بیچتے۔

زرخرید غلاموں کے علاوہ جنگی قیدی بھی غلام بنائے جاتے تھے۔یہ جنگی قیدی افریقہ، پارس،انڈیا اور افغانستان سے تعلق رکھتے تھے۔مثلاً مریٹہ کے بارے میں خیال ہے کہ وہ مرہٹوں کی اولاد ہیں جو احمد خان اور نصیر خان کی طرف سے ہندوستان پہ کیے گئے حملے میں پکڑے گئے تھے۔مری اور بگٹی کے اندر غلاموں کی اکثریت اسی مریٹہ کی تھی۔یہ صرف احمد خان کی جنگ میں

حاصل نہیں کیے گئے بلکہ سلو یا میتھی سن کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ بہت پہلے ہمایوں نے جب دوبارہ تخت دہلی پر قبضہ کیا تھا تو بلوچوں کے حصے میں چالیس ہزار قیدی آئے تھے۔ وہ اُن کے جنگجوؤں نے آپس میں بانٹ لیے، جن میں مری اور بگٹی بھی شامل تھے۔(34)

اسی طرح ہزارہ قبیلے کے لوگ غلاموں کی صورت میں بلوچوں میں موجود تھے، جنھیں افغانستان کے ہزارہ جات کے علاقے سے لایا گیا تھا۔(35)

آج صورت یہ ہے کہ بالخصوص مشرقی بلوچستان میں سرداروں کے اپنے گاؤں کی آبادی کی اکثریت انھی غلاموں پر مشتمل ہے۔ سردار کی خدمت گزاری اُن کا اہم ترین فریضہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ سردار کے محافظ بھی ہوتے ہیں۔ نیز یہ غلام سرداروں کے مخالفوں اور مشکوک وفاداریاں رکھنے والوں سے بھی نمٹتے تھے۔(36)

شخصی غلامی کے درمیان ایسا بھی ہوتا تھا کہ کئی مالک مل کر ایک مشترک غلام رکھیں۔ غلام عورتوں کو غلام مردوں سے بھی شادی کی اجازت تھی اور کبھی کبھی آزاد افراد بھی ان سے شادی کر لیتے تھے مگر خود مالک ان عورتوں سے شادی کرنے کا مجاز نہ تھا۔(37)

مکران کے اندرونی علاقوں میں ماضی میں کچھ افریقی غلاموں سے کھجور کے کھیتوں میں کام کرایا جاتا تھا۔ وہاں بہت سے افریقی نژاد باشندے بیگار کے مزدوروں (Bonded lobour) کے بطور ابھی حال تک کام کرتے تھے۔ باں کلینک نامی دالوں کی پھلیوں کی بھوسی الگ کرنے کا کام نہایت قلیل اجرت پر سیاہ فام باشندوں ہی سے کرایا جاتا رہا ہے۔

اگرچہ بعد کے خان قلات نے ہندوستان کی انگریزی حکومت کے دباؤ پر غلامی کا نظام 1914ء میں قانونی طور پر ممنوع کر دیا تھا مگر 1950ء کی دہائی تک صاحبِ حیثیت گھرانوں میں غلام رکھنے کا رواج موجود تھا۔(38)

بلوچستان کی عوامی تاریخ دکھوں سے بھری تاریخ ہے!

مجھے ابراہیم عطائی کی اس بات میں اچھا خاصا وزن نظر آتا ہے کہ مغل اور چاکر کے عہد سے پہلے بلوچوں میں غلام نہیں تھے۔(39) اس لیے کہ اُس وقت وہ اپنے جنگی قیدی قتل کرتے تھے۔

******

سولہویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی کے اوائل تک بلوچستان میں کئی ریاستوں کی تشکیل ہوئی جن میں قبیلوں کے جاگیردار بنتے ہوئے اشرافیہ نے' حکومت سنبھالی۔ یہ دراصل بلوچستان میں کنفیڈریشن کا عہد تھا جس میں فوجی کارروائیاں کی گئیں، اتحاد بنائے گئے۔ اور آخر میں جا کر قلات کو ایک لحاظ سے ایک مرکزی مقام حاصل ہوا۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک نادر شاہ کی سلطنت تحلیل ہوئی۔ مغل بھی کمزور ہوئے۔ اس کے نتیجے میں پورے بلوچستان کے لیے ایسے حالات پک گئے کہ وہ ایک واحد فیوڈل ریاست کی چوکھاٹ میں متحد ہو جائے۔ اس اتحاد نے خانیوں میں سب سے طاقت ور خانی یعنی قلات کے حکمران کو تخت پر بٹھا دیا۔ یہ عہد خانی کو مضبوط بنانے اور اسے توسیع بخشنے کا عہد تھا۔ یاد رہے کہ کچھی کے عظیم زرعی وسائل قلات کی خانی کی پشت پر تھے۔

نصیر خان (1750-1795ء) کو بلوچستان کا بیگلر بیگی (بیگوں کا بیگ) کہا جاتا ہے۔ ''بیگلر بیگی'' دراصل ترک لفظ ہے۔ ''بیگ'' کے پاس انتظامی اتھارٹی ہوا کرتی تھی۔ وقار کی علامت کے بطور اُسے سلطان کی طرف سے ایک جھنڈا ملتا تھا۔ جس ضلعے کا وہ حاکم ہوتا ہے، اس ضلعے کو بھی سنجاق کہا جاتا تھا۔ اور خود اُسے ''سنجاق بیگی' کہا جاتا تھا۔

ایک ''بیگلر بیگی'' (جسے بعد میں والی بھی کہا جانے لگا) بہت سارے سنجاق بیگیوں کے اوپر قائم ہوتا۔ ایک ایسا یونٹ جو بہت سارے سنجاقوں پہ حکمرانی کرتا تھا۔ اس پورے علاقے کو ''بیگلر بیگی بیک'' یا ''ایالات'' کہتے تھے۔(40)

وہ تقریباً نصف صدی (45 برس) تک حکمران رہا۔ وہ بلوچوں کی تاریخ کا سب سے طاقت ور حکمران ہو گزرا ہے۔

بیگلر بیگی نصیر خان کی سلطنت کا جغرافیہ دیکھیں تو آپ اُس کی وسعت پہ حیران رہ جائیں گے۔ اس نے مکران، لسبیلہ اور خاران کے علاوہ کئی چھوٹی بندرگاہوں کو بھی اپنی سلطنت کا حصہ بنایا۔ یوں اُس کی ریاست مغرب میں بمپور، جاسک اور دیزک تک کی ملکیت رکھتی تھی۔ شمال میں یہ سلطنت شال کے علاقوں تک جاتی تھی۔ یہ شمال مشرق میں ڈیرہ غازی خان، داجل اور ہڑند

کی مالک تھی۔مشرق میں اس کا علاقہ جیکب آباد کے اُس پار سندھ کی سرحد تک پھیلا ہوا تھا۔جنوب میں لسبیلہ اور کیچ اس کی سلطنت میں شامل تھے۔کراچی کی عظیم بندرگاہ تو تھا ہی۔

نصیر خان نے احمد خان کی بزرگوارانہ بالادستی 1757ء تک قبول کیے رکھی ۔مگر 1758ء میں اس نے اپنی آزادی کا اعلان کیا۔ظاہر ہے کہ سپر پاور احمد شاہ کو یہ گوارا نہ ہوا۔چنانچہ اس نے سردار شاہ ولی کی قیادت میں فوج بھیجی ، اور بلوچستان پر حملہ کرادیا۔قلات سے 70 میل شمال میں پڑنگو وَڈ کے مقام پر زبردست جنگ ہوئی ۔بلوچوں نے اِس سپر پاور احمد شاہ کی فوجوں کو شکست دی۔

اب احمد شاہ نے خود اپنی سربراہی میں ایک بہت بڑی فوج جمع کی اور بلوچستان پر حملہ کردیا۔(41) پہلی لڑائی سے 3 میل کے فاصلے پر گھمسان کی جنگ ہوئی۔خان نے اِس بار حکمت عملی تبدیل کی۔ وہ منظّم اور عمدہ صورت میں قلات پسپا ہوا۔ جہاں اس نے پہلے ہی سے شدید مزاحمت والی لڑائی کی تیاری کر رکھی تھی۔تین دفعہ حملوں کے بعد جب حملہ گر، قلات کو حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو اس نے مذاکرات کی دعوت دی اور اِس طرح ایک سمجھوتہ ہوا۔(42)

یہ معاہدہ دو برابر اور خودمختار ریاستوں کے بیچ تھا۔معاہدے میں صرف ایک شق ایسی تھی جس میں احمد خان کی بالادستی کی بُو آتی ہے۔وہ یوں تھا کہ اگر احمد شاہ دشمنوں سے لڑے تو بلوچ مدد کی علامت کے بطور ایک فوجی دستہ روانہ کریں گے۔مگر وہ بھی اس شرط پر کہ احمد شاہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ فوجی ہتھیاروں اور اخراجات کے بطور خان قلات کو دیتا رہے گا۔

احمد شاہ نے نصیر خان کی آزادی کو یوں تسلیم کیا تھا:''قلات خدا نے تمھیں بخشا ہے اور تمہارے پاس ہی رہے گا''۔(43)

1769ء کے جنگِ مشہد میں نصیر خان نوری نے ایرانی فوجوں کے مقابلے میں افغان بلوچ متحدہ افواج کی کمان کی ۔اس جنگ کی فتح پر احمد شاہ نے بے اختیار ہو کر نصیر خان کو ''سردارِ وفادار'' کہہ کر گلے سے لگایا۔(44)

اس سے پہلے 1761ء میں احمد خان ابدالی نے مرہٹہ کے خلاف پانی پت کی تیسری جنگ لڑی۔خانِ قلات نے دس ہزار کی تعداد میں بلوچ فوج، پرایا علاقہ کو فتح کرنے بھیجی جو احمد خان کے ساتھ راولپنڈی کے مقام پر جاملی۔نصیر خان خود پندرہ ہزار فوج لے کر ابدالی کے ساتھ پانی پت میں جاملا۔اس پچیس ہزار بلوچ نے پانی پت کی جنگ میں اہم رول ادا کیا اور مرہٹہ کو شکست دی۔(45)

اسی طرح جب لاہور اور ملتان میں سکھوں کی آزادی اور سرہند اور جالندھر دوآب کے ہاتھ سے نکل جانے کی خبر احمد شاہ نے سنی تو اس نے پنجاب کی طرف کوچ کرنے کا قصد کیا۔اس نے اپنے بلوچ حلیف میر نصیر خان کو بھی سکھوں کے خلاف جہاد میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ نصیر خان کے نام اس کے خط میں ہمیں اس کی سامراجیت، قبضہ گیری اور نوآبادیاتی ذہنیت صاف نظر آئے گی۔خط یوں ہے:

''مجھے ملتان اور ڈیرہ جات سے اطلاع ملی ہے کہ یہ ملعون کتے اور لالچی کافر، مسلمانوں کو شکست دے کر ملتان کے علاقے پر قابض ہو گئے ہیں۔انھوں نے لاتعداد مسجدیں شہید کر دی ہیں اور مسلمانوں کو قیدی بنا کر لے گئے ہیں۔اس صورت میں جبکہ یہ لعنتی فرقہ ایسے مظالم ڈھا رہا ہے، آپ کیسے حج پر جانے کا ارادہ کر سکتے ہیں؟ آپ کو چاہیے کہ آپ قلات سے پنجاب کا رخ کریں۔میں اِدھر سے روانہ ہو رہا ہوں اور ہم دونوں مل کر ان سرکش لوگوں کی مکمل بیخ کنی کر دیں گے۔یقین جانو کہ ان بت پرستوں کے خلاف جہاد، حج سے افضل ہے۔تم میرے بیٹے کا درجہ رکھتے ہو اور مسلمان بھائی بھی ہو، اس لیے فوراً آؤ تا کہ ہم ان کفار کا جلد سے جلد خاتمہ کر دیں''۔(46)

یوں نصیر خان نے حج کا اپنا پروگرام ملتوی کر دیا اور احمد خان کے ساتھ مل گیا۔

احمد شاہ اٹھارہ ہزار آدمی افغانستان سے لے کر چلا۔اس کا اتحادی نصیر خان بارہ ہزار سپاہی لے کر ایمن آباد میں اس سے آن ملا۔سکھوں کی راہنمائی سردار چڑھت سنگھ کر رہا تھا۔اس نے بلوچ ہراول دستے کو بےخبری میں آن لیا جس کی سربراہی سردار گوہرام خان اور احمد خان

بلیدی کرر ہے تھے۔حملہ اتنا سخت تھا کہ احمد خان بلیدی اوراس کا بیٹا پہلے ہی حملے میں مارے گئے ۔اس لڑائی میں مزار محمد، غلام حسین بنگلزئی ، بہادر ساسولی اور میر عبدالنبی رئیسانڑیں نے نمایاں کردارادا کیا۔(47)

اِس جنگ کے خاتمے پر دونوں حلیفوں نے ایک دوسرے کوخدا حافظ کہا۔احمد خان نے شال (کوئٹہ) کا علاقہ اُس کے حوالے کیا۔اُس نے نصیر خان کو چناب، جھنگ اور ملتان کے علاقے بھی دینا چاہے مگر نصیر خان نے قبول نہ کیا۔(48)

یہ تو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ نصیر خان نے گوادر 1784ء میں فتح کر لیا تھا۔اس نے اٹھارویں صدی کے آخر میں خاران پر بھی قبضہ کرلیا اور وہاں کا حکمران عباس خان نوشیروانی اپنی آمدنی کا کچھ حصہ اُسے دیتا تھا۔واضح رہے کہ نوشیروانی کی آمدنی کا پچھتر فیصد حصہ کسانوں اور خانہ بدوش مالداروں کے مالیہ سے حاصل ہوتا تھا اور پچیس فیصد اُن کاروانوں سے کسٹم کی صورت میں ملتے تھے جو خاران کے علاقے سے گزرتے تھے۔

نصیر خان نے جب ریاست لسبیلہ پر قبضہ کر لیا تو اُس وقت وہاں کسانوں اور ماہی گیروں کے ایک سو پچاس گاؤں تھے۔لسبیلہ کے جام (حاکم) اپنی آمدن کا نصف حصہ خان کو دیتے تھے۔ یہاں مالیہ کی شرح مستقل پانی والی زمینوں سے پیداوار کا تیسرا حصہ ہوتا تھا،اور سیلابی پانی والی زمینوں سے پانچواں حصہ ۔ یہاں اشیاء کی قیمتِ فروخت کے ایک فیصد کے حساب سے چونگی لیا جاتا تھا۔

جانی نقصانات تو جنگوں میں ہوتے ہی ہیں۔اور وہ ہلاکتیں عوام ہی کی ہوتی ہیں ۔ کمانڈر اور امرا تو بہت دور اور محفوظ مقام پہ ہوتے ہیں مگر جنگوں کے سارے اخراجات بھی عوام ہی کو سہنے پڑے۔زرعی ٹیکسوں کا بوجھ بڑا تھا۔تجارت کی ہر چیز پہ سیلز ٹیکس لگا ہوا تھا۔جرمانے وغیرہ اس کے علاوہ تھے۔داخلی طور پر یہ ایک سخت گیر حکمرانی تھی۔

بلوچوں کی اِس ریاست کا ایک جھنڈا تھا جو اوپر کی طرف سرخ تھا اور جس کا نچلا حصہ سبز تھا۔سرخ حصے کو جنگ اور آزادی کی علامت سمجھا جاتا تھا اور سبز حصہ امن و انصاف کا نشان تھا۔

(49)(حیدرآباد میں تالپور بلوچ فیوڈل ریاست کے جھنڈے میں یکے بعد دیگرے چھ سات سرخ اور سفید پٹیاں تھیں)۔

کلات دربار کی تحریری زبان فارسی تھی۔یوں خارجہ امور فارسی میں نمٹائے جاتے تھے۔ بلوچی،عوامی زبان تھی۔مباحثے اور کانفرنسیں بلوچی میں ہوتی تھیں۔

ریاست کی اپنی کرنسی ہوتی تھی جسے ''نصیر شاہی یا کرم شاہی'' کہتے تھے۔اُس پر نصیر خان کا نام کندہ ہوتا تھا۔اس میں کاپر کے 48 پائی ہوا کرتے تھے۔ یہ ''شاہی'' اُس وقت پڑوسی افغان کرنسی کے برابر ہوتی تھی، جسے ''احمد شاہی'' کہتے تھے۔بلوچ کرنسی کے یہ سکے کلات ہی میں بنائے جاتے تھے۔

کلات کی تجارت اور فنانس میں ہندوؤں کی مکمل اجارہ داری تھی ۔ یہ شمالی سندھ، اور ملتان اور ڈیرہ غازی خان سے آئے ہوئے تاجر پیشہ لوگ تھے۔ ہندو بلوچستان کے ہر علاقے میں پائے جاتے تھے۔تاجر،ارسٹوکریسی کو قرضے اور تعیش کا سامان دیتے تھے۔وہ سردار اور خان کو مختلف قسم کے ٹیکس دیتے تھے،اس لیے انھیں مقتدرہ حلقوں کی طرف سے مکمل حفاظت حاصل تھی۔

ہندو ایک طرف تو وسطی بلوچستان کے پہاڑی علاقوں میں سامان کے تبادلے کو منظّم کرتے تھے تو دوسری طرف سندھ،کچھی،سبی اور لسبیلہ کے میدانی خطوں میں تجارت کرتے تھے۔ پہاڑی علاقوں میں اناج،پشم،قالین،چمڑا،تمباکو،پوٹاش،کھجور اور خشک میوے برآمد ہوتے تھے۔ جبکہ میدانی علاقوں سے درآمدی اشیا میں ٹیکسٹائل،تیل جوتے،لوہے کے برتن،مصالحہ جات،نمک اور جانور شامل تھے۔سرداروں نے تجارتی شاہراہوں پر ٹیکس بڑھا رکھے تھے۔

تقریباً سارا تاجر طبقہ ہندوؤں پر مشتمل تھا۔بلوچ سماج میں ہندوؤں کو عمومی طور پر مذہب کے اعتبار سے کبھی بھی امتیازی سلوک سے دوچار ہونا نہ پڑا۔آج بھی ہمیں لسبیلہ،کچھی،سبی،کلات اور خاران میں مسجدوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے مندر،مینار بلند کیے ملیں گے۔نصیر خانی رواج کے مطابق البتہ وہ پگڑی نہیں پہنتے تھے اور گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتے تھے۔انھیں پیشانی پر

ٹکہ کا نشان لازماً لگانا تھا اور مسلمانوں سے پیچھے چلنے کا حکم تھا۔

نصیر خان نوری کے زمانے میں بلوچ تاریخ میں پہلی بار ایک باقاعدہ نظامِ حکومت قائم ہوئی۔ تمام قبائل کو بلوچ کنفیڈریسی کی شکل دی گئی اور سربراہان پر مشتمل بلوچی مجلس (پارلیمنٹ) کی بنیاد پڑی۔ وطن کا نام بلوچستان رکھا گیا اور اسے ایک آزاد اور خودمختار ملک کی حیثیت سے دیگر ممالک سے تسلیم کروایا۔

احکامات، فرمان کی شکل میں جاری ہوتے تھے۔ چوں کہ معاشرہ بہت حد تک ٹھیٹ قبیلوی رواجوں پر تکیہ کرتا تھا اس لیے حکومت قبیلوی رشتوں کے زیر اثر رہی۔ بلوچستان میں جاسوسی کے لیے آنے والے ایک انگریز، پوٹنگر نے 1810ء میں نصیر خان کی تعریف یوں کی تھی:

''اگر ہم نصیر خان کے کردار کو جانچیں (خواہ سپاہی کی حیثیت سے، ایک حکمران کی حیثیت سے، یا ایک شہزادے کی حیثیت سے) تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ تمام فرائض کے لیے ضروری خوبیوں کا غیر معمولی مجسم مجموعہ تھا۔ اس نے اپنا پیشہ خود اپنے بھائی کو قتل کرنے سے شروع کیا۔۔۔ اسے دولت کی خواہش ڈانواں ڈول نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے کہ اس نے اپنے خادموں سے زیادہ بہتر لائف سٹائل کبھی نہیں گزاری۔۔۔ نصیر خان نے ایک روشن فکر قوم پہ حکمرانی کی۔۔۔ وہ لبرل تھا، بہادر، منصف اور معاف کرنے والا۔ وہ برے اور ناموزوں حالات میں صابر تھا۔ وہ اپنے قول کا اس قدر پابند تھا کہ کبھی کسی نے اسے وعدہ توڑتے ہوئے، یا اپنی بات سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہوتے نہیں پایا''۔(50)

نصیر خان کی سیاسی بصارت، اندرونی سیاسی قبائلی اقتدار کے میکنزم پر پوری طرح حاوی تھی۔ اس نے نہ اپنی تلوار کو میان میں رکھا اور نہ اپنے سرداروں اور لشکریوں کی تلوار کو میان میں رہنے دیا۔ اس میں ذہانت، چابک دستی اور فراست کے علاوہ کردار کا کرشمہ بھی موجود تھا۔ جو ایک اچھے لیڈر، حکمران اور کمانڈر کی کامیابی، استحکام اور ہردل عزیزی کی اساس ہے۔ اُس نے اپنے 45 سالہ دورِ حکمرانی میں اندرونی اور بیرونی تمام قوتوں کے درمیان ایسا توازن برقرار رکھا جو اس کی کامیابیوں کو استحکام اور خوش حالی میں بدلنے کا موجب بنتا رہا۔(51)

مگر یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ عورت کو ورثہ دینے کا شرعی حق اسی نصیر خان نوری ہی نے منسوخ کردیا۔(52)

جیسے کہ ذکر ہو چکا ہے کہ ایک کلات ریاست میں باقاعدہ فوج (800 گھڑسوار) رکھنے کے علاوہ ''سرِ سرداران ساراوان'' اور ''سرِ سردارانِ جھلاوان'' نامی دو عہدے قائم کیے گئے۔ ان عہدوں سے ان دونوں جغرافیائی حصوں کے سارے سردار انھی دو سرداروں کے ماتحت آ گئے۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ محض دو آدمیوں سے معاملہ کرنا بہت آسان تھا۔ نصیر خان اُن دونوں کو کونسل میں اپنے ساتھ بٹھاتا اور انھیں قیمتی انعامات سے نوازتا۔ مثلاً اس نے ان نئے عہدوں پر فائز دونوں سرداروں کو سونے کا ایک ایک خنجر دیا، چاندی کے ساز و سامان سے لدا ہوا ایک ایک گھوڑا دیا اور ایک کمخواب و زربفت کا لباس بھی۔

وہ اپنے پیش رووں کی طرح سرداری رشتوں کو القاب، تحفوں اور احسانات کے ذریعے استعمال کرتا تھا۔ اس نے کنفیڈریسی کی کمزور ہیرارکی کو خود اپنے گرد ادارے کی حیثیت سے کامیابی کے ساتھ ڈھال دیا۔ اس نے کچھی کی زرعی زمینیں وفادار قبائل کو بخش دیں۔ خان کی طرح ان قبائل کے سرداروں نے بھی زمین کے زرخیز ٹکڑے اپنے لیے رکھ لیے اور بقیہ زمین قبائل میں بانٹ دی۔ سردار کو مالکِ اعلیٰ والے حقوق حاصل تھے۔ دوسرے لفظوں میں کچھی کی زمینیں سرداری اور جاگیرداری نظام کے لیے زبردست مالی منفعت ثابت ہوئیں۔ عوام کے لیے تو بس اتنی پیداوار بچ جاتی کہ وہ اگلے دن کی مشقت کے لیے زندہ رہ سکیں۔

یوں، کچھی کی زرخیز زمینوں پر فرماں روا کے حقوق ملنے سے ارسٹوکریسی زبردست طور پر مضبوط ہوئی۔ جس میں احمد زئی خاندان کے علاوہ قبائلی سرداروں کے خاندان بھی شامل تھے۔ زمین کی بخشش ''شادی غم'' کے فلسفے کا حصہ تھی اور ان زمینوں کو ''غم زمینیں'' کہا جاتا تھا۔ درحقیقت یہاں میر نصیر خان نے مستقل پانی رکھنے والی زمینیں اپنے پاس رکھ کر ایک نئی ریاست کے قیام کا آغاز کیا۔

اِس زمانے میں قلات شہر کی خوبصورتی پہ خصوصی توجہ دی گئی۔ قلعہ تعمیر کرایا گیا، وادی میں کابل اور پارس سے لائے ہوئے درختوں کے باغ لگوائے گئے (53)۔

اُدھر افغانستان میں نصیر کا ہم منصب، احمد شاہ اپنی فعال اور واقعات سے بھرپور حکمرانی کے اواخر میں ایک تکلیف دہ بیماری میں مبتلا ہوا۔ اس کے چہرے کے بالائی حصے کو ایک خوفناک پھوڑے (Ulcer) نے تباہ کر دیا۔ وہ غزنی کے جنوب میں ماروف نامی قلعے میں واپس ہوا اور وہیں مر گیا۔ اس کا بیٹا تیمور شاہ تخت نشین ہوا مگر اس کی بیس سالہ حکمرانی، باپ کی اکٹھی کی ہوئی سلطنت کے ٹکڑے ہونے والی حکمرانی تھی۔

اِدھر بلوچوں میں سندھ کے اندر تالپور اور بلوچستان کے اندر کمبرانڑیں زبردست قوت کے بطور ابھرے۔(54)

******

اِسی دوران مشرقی بلوچستان کے پہاڑوں میں حسنڑیں نام کا ایک قبیلہ بہت طاقتور تھا۔ موجودہ مری قبیلے کا تقریباً سارا علاقہ انھی کا تھا۔ وہاں سے وہ دوسرے پڑوسی کمزور قبائل میں اپنی دست اندازیاں جاری رکھے ہوئے تھا۔ اُس وقت اس قبیلے کے سربراہ کا نام نور محمد تھا، جو محمد کا بیٹا تھا۔ اور محمد، سردار حسن کا بیٹا تھا۔ نور محمد بیس سال تک حسنڑیں کی سرداری کرتا رہا۔ اس کی موت کے بعد صادق اس قبیلے کا سردار بنا۔ صادق کے زمانے میں مری قبیلے نے کاہان نامی علاقے میں ایک قلعہ بنایا اور وہاں رہنے لگے۔

ساتھ میں پیلاوغ کے اندر مری قبیلہ اور حسنڑیں کے درمیان ایک بڑی لڑائی ہوئی۔ اس میں 200 مری اور 100 حسنڑیں قتل ہوئے۔ صلح ہوگئی۔ مگر ایک سال بعد زمین کے ٹکڑے پر دوبارہ لڑائی ہوئی۔

حسنڑیں کچھی اور آس پاس کے علاقوں پر ڈاکے مارتے رہتے تھے۔ سبی کے باروزئی اُن سے شکست کھا کر کمزور پڑ گئے تھے۔ میر صادق کچھی کو ویران کرنے کے بعد تلّی کے علاقے میں رہائش پذیر تھا۔ مری، بگٹی اور کھیتر ان سب کے سب حسنڑیں سے نالاں تھے۔ مشرق میں ڈیرہ غازی خان کا علاقہ تک اُن کے گھڑسواروں کی گرد میں غرق و غلطاں تھا۔ رند بلوچ سے تعلق رکھنے والا یہ قبیلہ بہت جنگجو تھا۔

جس وقت ہڑند اور داجل میر نصیر خان نوری کے تاج تلے آئے تو اُس کے سواروں اور افسروں کو اکثر قلات سے ہڑند اور داجل جانا ہوتا تھا۔ مگر ان کے راستے میں غرّاتے ہوئے حسنڑیں آتے تھے۔ تنگ آ کر میر نصیر خان، حسنڑیں کی جڑ اکھاڑنے پر تیار ہو گیا۔ ادھر مری قبیلہ حسنڑیں کے خلاف نبرد آزما تھا۔ ماوند کا شادیھان اُس وقت مری کا لیڈر تھا اور قبیلے کی طرف سے ننگ و جنگ اُسی کی رکھوالی میں تھے۔ اس نے حسنڑیں کے خلاف نصیر خان نوری سے فوجی مدد مانگی۔ کہتے ہیں کہ وہ بہت عرصہ وہاں قلات میں پڑا رہا مگر خان فوجی امداد میں پس و پیش کر رہا تھا۔ ایک دن جب وہ سائبان (منّاہ) کے نیچے بیٹھے تھے تو چھت سے ایک سانپ نیچے گر گیا۔ خان مع مصاحبین کے فوری طور پر باہر نکل گیا مگر شادیھان وہیں بیٹھا رہا۔ سانپ اُس کی طرف بڑھنے لگا اور وہ آرام سے بیٹھا رہا۔ جب سانپ بہت قریب آیا تو اس نے خنجر نکالا اور بیٹھے بیٹھے وہیں اُسے مار دیا۔

خان مصاحبین سمیت جب واپس آیا تو اُس پر بہت غصہ ہوا، کہ آئے ہو فوج مانگنے اور بہادری دکھاتے ہو، ہم سب بھاگے تم بیٹھے رہے۔ کہتے ہیں کہ حاضر جواب شادیھان نے فوراً اپنا کرتہ اتار لیا۔ اور تلواروں کے بےشمار تازہ اور پرانے زخم اُسے دکھائے' کہ اس قدر لڑائی و تباہی کے باوجود میں فوجی مدد لینے، عرصے سے دربار میں پڑا ہوں مگر جب تم فوج نہیں دے رہے تو سوچا بہتر ہے یہیں تمہارے دربار میں مر جاؤں۔ مگر جب سانپ میری جانب نزدیک آیا تو اچانک خیال آیا کہ لوگ تو یہ کہیں گے کہ مری ہکا بکا سٹی گم ڈر کے مارے حرکت کیے بنا بیٹھا رہا اور سانپ نے آ کر اُسے ڈس لیا، اس لیے میں نے اُس کالک سے بچنے کی خاطر اُسے مار دیا۔

خان اس قدر متاثر ہوا کہ فوج اُسے دے دی۔ شادیھان نے کلات سے فوج لے کر حسنڑیں پر چڑھائی کی۔ حسنڑیں نے مری اور خان کی مشترکہ افواج سے شکست کھائی اور کوہلو کی طرف پسپا ہوا، جہاں اس وقت زرکون آباد تھے۔ یہ 1780ء کی بات ہے۔

دوبارہ لڑائی دولا ونگا کے مقام پر ہوئی جہاں میر صادق مارا گیا اور حسنڑیں کی طاقت مکمل طور پر کچل دی گئی۔ اِسی لیے اس جگہ کا نام ''صادق ونگا'' پڑ گیا۔

ایک روایت نما کہانی سنیے۔ ایسی سبق آموز اور مبالغہ والی کہانیاں انسان بہت بناتا رہتا ہے:

''سردار صادق کے دونوں ہاتھ کہنیوں تک کاٹ کر اُس کی ماں کو پکڑا دیے گئے۔اور اس سے کہا گیا کہ وہ بستی کی گائیاں چرانے لے جائے۔اور اکلوتے بیٹے کے دونوں بازو بطور چھڑی استعمال کرے۔

''شام کو وہ گائیاں واپس بستی لائی تو اُس بوڑھی ماں سے سوال کیا گیا کہ'' کیا انسان پہ اِس سے بھی برا وقت آ سکتا ہے؟'' تو اس نے جواب دیا'' ہاں۔ایک حالت اِس تباہ کن حالت سے بھی بدتر ہے۔اور وہ ہے: بھوک''۔واضح ہو کہ مارکس نے اس بزرگ خاتون کے سو سال بعد اپنا فلسفہ دیا۔

خان اور مری کی مشترکہ افواج نے حسنڑیں کو شکست دے کر اُسے اس علاقہ یعنی ماوند، جنتلی، نیساؤ، پیلاوغ، کنل اور کوہلو سے باہر نکال دیا۔حسنڑیں تتر بتر ہو گئے۔ایک ٹولی کھیترانڑ کے زیرِ سایہ رڑکنڑ جا بسی، ایک گروپ دُکی میں تل نامی علاقے میں شادوزئی کی پناہ میں گیا اور ایک حصہ سیوی کے میدانوں میں جا بیٹھا۔باقی حصہ متفرق طور پر دیگر تمنات میں شامل ہو گیا۔پیہرسن ان کی تباہی کے سال کو 1830ء بتاتا ہے۔

شاید مری کے ساتھ خان کا تعارف بھی اسی زمانے میں ہوا۔اور یہ تعلق بڑھتے بڑھتے بالآخر رعایا اور بادشاہ کے تعلقات بن گئے۔یہ فیوڈل شاہی مشرقی قبائل پر اس قدر سخت تو نہ تھی (کبھی بھی نہ رہی) لیکن حکمرانی تو بہر حال حکمرانی ہوتی ہے۔

اس فیوڈل ریاست کی کنفیڈریسی کے تحت مشرق بلوچستان کے قبائل بہر حال اپنی نزدیک بین دید سے باہر نکلے اور قبیلوی تنگ نظری سے نکل کر کسی نہ کسی طور بلوچ کے عمومی لنگ و لاغر کارواں کی سُست گرہ میں بندھ گئے۔

مری نے حسنڑیں سے قبضہ کی ہوئی ساری زمین اپنے قبیلے کے نرینہ افراد (بشمول نوزائیدہ بچے) میں تقسیم کی۔ماوند، ڈھل اور ونگا سر تک کا سارا علاقہ مری کا ہوا۔رقبہ و حدود کی وسعت اپنے ساتھ شکم سیری اور سُکھ بھی لائی۔مری قبیلہ سرسبز اور پُر گنج چراگاہوں، حیات آفریں چشموں، ندیوں، ہوادار چوٹیوں، طویل دریاؤں، غنیمت میں ملی اونٹنیوں اور خمدار تلواروں جیسی بے شمار نعمتوں کا مالک بن گیا۔حسنڑیں اور زرکون کاشتکاری میں مہارت رکھتے تھے۔مگر مری نے اس

مہارت سے بہت کم فائدہ اٹھایا۔اسے وسیع زمین اور کاشتکاری کی بجائے اپنی بھیڑ بکریاں، پہاڑ پر محبوب گیت اور مویشیوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں زیادہ بھلی لگیں۔یہی خوش الحان گھنٹی بعد میں ہمارے اپنے گلے کی گھنٹی بن گئی اور صدیوں تک انگریز اور پاکستان سے لے کر مقامی فیوڈل اور معتبر اسی گھنٹی کی گرہ تنگ کرتے رہے۔

صادق کے بعد عظمت خان اور اس کے بعد سید خان، حسنڑیں کے سردار بنے۔اس کے بعد عیسیٰ خان اور محمد خان بالترتیب سردار ہوئے۔

******

قصہ کوتاہ۔کلات کی حکومت اب ایک طرف کراچی سے ایران کی سرحد تک قائم تھی۔اور دوسری طرف کوئٹہ سے ڈیرہ جات تک۔یعنی اب لسبیلہ، مکران، خاران، کوئٹہ، نصیر آباد، سبی، مری اور بگٹی اور پھر ہڑند اور داجل پر مشتمل بلوچستان ایک ہو چکا تھا۔(54)

خانِ کلات کی شخصی اراضی کے اجارہ گر، خان کو پیداوار کا مالیہ عموماً زمینوں کو پانی دینے کے طریقوں کے حوالے سے دیتے تھے۔یہ تین طریقے یوں تھے:

1۔ کنوؤں یا کاریزوں سے سیراب ہونے والی زمینوں سے پیداوار کا بیسواں حصہ لیا جاتا تھا۔چونکہ کنوؤں اور کاریزوں کو جاری و ساری رکھنے کے لیے بہت محنت کرنا پڑتی تھی، اس لیے ان کسانوں کو پیداوار کا بیسواں حصہ دینا ہوتا تھا۔

2۔ بارانی زمینوں سے پیداوار کا دسواں (کبھی کبھی پندرھواں) حصہ بطور مالیہ لیا جاتا تھا۔

3۔ باغوں سے پیداوار کا پانچواں حصہ مالیہ کی شکل میں لیا جاتا تھا۔

نصیر خان کے دور میں کپاس، نیل اور گھی کی پیداوار خوب بڑھی۔وہ خود بھی کندھار اور ہندوستان سے مختلف فصلوں اور درختوں کے بیج اور نہال جمع کر کے لاتا رہتا تھا۔

اُس کے پچاس سالہ دورِ حکومت میں تجارت کو زبردست فروغ ملا۔ہندو تاجر کاروانوں کی شکل میں تجارت کرتے تھے۔چیزوں سے قیمتِ فروخت کا 0.5 فیصد کے حساب سے چنگی لیا جاتا تھا۔شاہراہیں استعمال کرنے پر کاروانوں سے پانچ روپیہ فی اونٹ کے حساب

سے محصول وصول کیا جاتا تھا۔ بحر ہند کی کئی بندرگاہیں اور تجارتی راہیں کلات اور وہاں سے کندہار تک کُھلیں۔ گویا ہندوستان اور وسطی ایشیا کے درمیان کلات کی حیثیت ایک تجارتی مرکز کی ہوگئی تھی۔ سونمیانی کی بندرگاہ ایک تجارتی وصنعتی مرکز تھی۔ خصوصاً کپڑے اور قالین کی پیداوار میں۔ بلوچستان سے گھوڑے بمبئی کو برآمد کیے جاتے تھے۔ رنگ کا سامان اور چمڑے کا سامان مسقط برآمد ہوتے تھے۔

درآمدات یں ہندوستان سے لوہا، ٹن، جست، فولاد، کاپر، نیل، اور سپاری۔ میکسیکو کے وہ خشک کیڑے جن سے قرمزی رنگ بنایا جاتا ہے، مصالحہ جات، ریشم، کمخاب، سونا، کپڑے اور چھینٹ۔

خراسان سے میوہ جات۔

سیستان سے فولاد اور تانبہ۔

شکارپور سندھ اور ملتان سے سفید کپڑا، چھینٹ، لنگیاں، پگڑیاں، اور نمک۔ (55)

******

بلوچ مملکت کا یہ ''پیٹر دی گریٹ'' جون 1795ء میں بہت خوش اور زبردست حکمرانی کے بعد سو سال کی عمر میں بمقام گنداواہ وفات پا گیا(56)۔ اس کے جنازے میں افغانستان اور اومان کے نمائندے موجود تھے۔ استنبول میں ''خلیفہِ اسلام'' اور شاہ ایران نے تعزیتی پیغام بھیجے۔ شاہ ایران نے خان کو ''شاہِ بلوچستان'' کہہ کر مخاطب کیا۔ اسے قلات میں دفن کیا گیا۔

نصیر خان نوری کے بعد اس کا بڑا بیٹا محمود اول سات برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ ایک تو نوری نصیر خان کی موت ہوگئی تھی، اور دوسری حقیقت یہ تھی کہ بلوچ قبیلوں کے سردار بہت مضبوط ہوگئے تھے۔ چنانچہ بلوچستان عملی طور پر راجواڑوں میں تحلیل ہوگیا۔ ریاست کی تحلیل میں ایک اہم عنصر یہ تھا کہ مختلف علاقوں کے حکمرانوں کی خواہش تھی کہ مجموعی آمدن میں بلوچستان کے سربراہ (خان) کا حصہ کم کر دیا جائے اور خود اپنا حصہ بڑھا دیا جائے۔ اس کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نصیر خان نوری کا سالانہ ریونیو تیس لاکھ روپے سے تجاوز کر چکا تھا۔ مگر اس کے بیٹے محمود

خان کی سالانہ آمدنی محض تین لاکھ روپے رہ گئی۔ اس لیے کہ کیچ، پنجگور، لس، دیزک اور خاران کے فیوڈل حکمرانوں نے ان علاقوں کے عوام پر عائد زرعی ٹیکس اپنے قبضے میں رکھ لیے۔

سندھ کے امیروں نے نصیر خان کی موت کے بعد بلوچوں کے کراچی شہر کے بندرگاہ پر قبضہ کرلیا۔ (57)

اب نصیر خان کی صورت میں مرکزی طاقت منظر سے ہٹ گئی تھی۔ اس کے بعد فیوڈلوں کے مابین پیدا شدہ نفاق اور بدنظمی سے تمام مشرقی قبائل نے فائدہ اٹھایا اور خود کو قلات کی خانی سے الگ کردیا۔ یہ قبائل انگریز کے آنے تک اپنی خودمختاری چلاتے رہے۔

نصیر خان کی موت کے بعد قلات کا سیاسی بحران معاشی مشکلات کی وجہ سے مزید شدید ہوگیا۔ ریونیو کم سے کم ہو رہا تھا، مگر دربار کے اخراجات اسی طرح شاہانہ ہی رہے۔ علاقے بھی خانی سے کٹتے رہے اور آپسی مناقشے بھی جاری تھے۔ اور تجارتی تنظیم بھی زیادہ منظّم نہ رہی۔

یوں بلوچستان ایک نئے قبائلی اور فیوڈل مرحلے میں داخل ہوگیا۔

******

ریفرنسز

1۔نائناسوائڈلر۔''قلات دی پولیٹیکل اکانومی آف اے ٹرائبل چیف ڈم''۔19(3)1992۔صفحہ 553

2۔آغانصیراحمدزئی۔''تاریخ بلوچستان''۔جلد چہارم۔صفحہ 295

3۔ایضاً۔صفحہ 303

4۔خان،احمدیارخان۔''مختصرتاریخ،قوم بلوچ وخوانین بلوچ''۔1972۔ایوان بلوچ کراچی۔صفحہ 37۔

5۔آغانصیرخان۔جلد پنجم۔صفحہ 9

6۔خان ،احمد یار خان۔''مختصر تاریخ،قوم بلوچ و خوانین بلوچ''۔1972 ۔ ایوان بلوچ کراچی۔صفحہ نمبر38۔

7۔گنکوفسکی اوردیگر۔''اے ہسٹری آف افغانستان''۔1985۔پراگریس پبلشرز،ماسکو۔صفحہ 111

8۔ہیتورام۔''تاریخ بلوچستان''۔سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور۔صفحہ 107

9۔خان،احمدیارخان۔''مختصرتاریخ،قوم بلوچ وخوانین بلوچ''۔1972۔ایوان بلوچ کراچی۔صفحہ 39

10۔نصیر،گل خان۔''کوچ وبلوچ''۔1969ء۔بلوچی پبلی کیشنز،لیاری،کراچی۔صفحہ 5

11۔آغانصیرخان۔''جلدپنجم''۔صفحہ 161

12۔ایضاً۔صفحہ 149

13۔گنڈاسنگھ۔''احمدشاہ ابدالی''۔1993ء۔تخلیقات لاہور۔صفحہ 14

14۔لارنس،لاک ہارک/طاہرمنصورفاروقی۔''نادرشاہ''۔تخلیقات لاہور۔صفحہ 14

15۔گنڈاسنگھ۔صفحہ 160

16۔ایضاً۔صفحہ 166

17۔عطائی،محمدابراہیم۔''دبلوچو......''۔صفحہ 21

18۔لارنس۔''لاک ہارٹ''۔صفحہ 166

19۔ایضاً۔صفحہ 166

20۔آغا،نصیرخان احمدزئی۔''جلدپنجم''۔صفحہ 179

21۔کچھی گزیٹیئر۔صفحہ 40

22۔گنڈاسنگھ۔صفحہ 37

23۔مبارک علی۔''بازاراوردوسرے مضامین''۔صفحہ 38

24۔جوناتھن لی۔''افغانستان''۔2018ء۔رشین بکس۔صفحہ 116

25۔سید،محمدلطیف۔''تاریخ پنجاب''۔1994ء۔تخلیقات لاہور۔صفحہ 433

26۔جوناتھن لی۔صفحہ 122

27۔سلیگ ہیریسن۔''اِن افغانستانز شیڈو''۔1981۔واشنگٹن۔صفحہ 16

28۔آغا،نصیرخان احمدزئی،''جلدپنجم''۔صفحہ نمبر233

29۔خان ،احمد یار خان۔''مختصر تاریخ،قوم بلوچ و خوانین بلوچ''۔1972ء ۔ ایوان بلوچ کراچی۔ صفحہ 43

30۔سبطِ حسن۔''پاکستان میں تہذیب کاارتقا''۔صفحہ 227

31 ۔فیروز احمد / فہمیدہ ریاض،''افریقہ...... پاکستان کے ساحلوں پر''۔کراچی کی کہانی ، رسالہ''آج''۔صفحہ نمبر180

32۔پیکولین۔صفحہ 146

33۔چارلس میسن۔''......Narratives''۔صفحہ نمبر433

34۔سلویامیتھی سن۔''ٹائیگرز......''۔صفحہ نمبر43

35۔پیہرسن۔صفحہ نمبر75

36۔ڈینس برے۔''سینس''۔صفحہ نمبر174

37۔پیہرسن۔صفحہ نمبر75

38۔فیروزاحمد/فہمیدہ ریاض۔''افریقہ......''۔صفحہ نمبر189۔

39۔عطائی،ابراہیم۔''A Dictionary of Tercinology of Pashtoons Trible Law and Usage''۔1979ء۔اکیڈمی آف سائنسز۔افغانستان کابل۔صفحہ 63

40۔بروان ہسین،و۔مارٹن۔''آغا،شیخ اینڈ سٹیٹ''۔1992ء۔ریڈبکس لمیٹڈلندن۔صفحہ 152

41۔جوناتھن لی۔صفحہ 124

42۔پوٹینگر۔صفحہ نمبر283

43۔گنڈاسنگھ۔''احمدشاہ ابدالی''۔صفحہ نمبر214

44۔اختربلوچ،''خوانین......''۔صفحہ نمبر43

45۔عبدالقدوس۔صفحہ نمر 44

46۔گنڈا سنگھ۔صفحہ نمبر294

47۔ایضاً۔صفحہ نمبر296

48۔ایضاً۔صفحہ نمبر301

49۔خان، میر احمد یار خان۔''تاریخ قومِ بلوچ وخوانینِ بلوچ''۔صفحہ نمبر1

50۔پوٹینگر۔صفحہ نمبر295

51۔بلوچ، حکیم۔''بلوچ قومیت، خانیت وسرداریت''۔2007۔گوشہ ادب کوئٹہ۔صفحہ 22

52۔ہتورام۔''تاریخ بلوچستان۔''صفحہ نمبر110

53۔پوٹینگر ، ہنری۔''Travel in Balochistan and Sindh''۔ 1976ء ،انڈس پبلی کیشنز کراچی۔صفحہ نمبر282

54۔بلیو۔ھ۔و۔''افغانستان اینڈ افغانز''۔1979ء۔سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور۔صفحہ نمبر23

54۔ملک، فدا حسین۔''بلوچستان، اے کنفلیکٹ آف نیریٹوز''۔2020ء۔لائٹ سٹون پبلشرز۔ صفحہ 4

55۔پوٹینگر۔صفحہ نمبر395

56۔پوٹنگر صفحہ۔نمبر284

57۔پوٹنگر صفحہ نمبر۔287

پیپلز ہسٹرِی آف بلوچستان

جلداول	پری ہسٹاریکل بلوچستان
جلددوم	بلوچ ریاست کی تشکیل
جلدسوم	قبائلی اور فیوڈل عہد
جلد چہارم	انگریز کا قبضہ
جلد پنجم	بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرنس